خاکم بدہن

مشتاق احمد یوسفی

۲۰۰۰ء

- دستِ زلیخا

مشتاق احمد یوسفی

بابائے انگریزی ڈاکٹر سیموئیل جانسن کا یہ قول دل کی سیاہی سے لکھنے کے لائق ہے کہ جو شخص روپے کے لالچ کے علاوہ کسی اور جذبے کے تحت کتاب لکھتا ہے، اس سے بڑا احمق روئے زمین پر کوئی نہیں۔ ہمیں بھی اس کلیہ سے حرف بہ حرف اتفاق ہے، بشرطیکہ کتاب سے مراد وہی ہے جو ہم سمجھے ہیں، یعنی چیک بک یا روکڑ بہی۔ دیباچے میں یہ وضاحت از بس ضروری ہے کہ یہ کتاب کس مالی یا الہامی دباؤ سے نڈھال ہو کر لکھی گئی۔ چنانچہ جو اہل قلم ذہین ہیں، وہ مشک کی طرح خود بولتے ہیں۔ جو ذرا زیادہ ذہین ہیں، وہ اپنے کندھے پر دوسروں سے بندوق چلواتے ہیں۔ خود دیباچہ لکھنے میں وہی سہولت اور فائدے مضمر ہیں، جو خودکشی میں ہوتے ہیں۔ یعنی تاریخ وفات، آلہ قتل اور موقع واردات کا انتخاب صاحب معاملہ خود کرتا ہے۔ اور تعزیرات پاکستان میں یہ واحد جرم ہے، جس کی سزا صرف اس صورت میں ملتی ہے کہ ملزم ارتکاب جرم میں کامیاب نہ ہو۔ ۱۹۶۱ء میں پہلی ناکام کوشش کے بعد بحمد اللہ ہمیں ایک بار پھر یہ سعادت بقلم خود نصیب ہو رہی ہے۔ تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد۔

یہ کتاب "چراغ تلے" کے پورے آٹھ سال بعد شائع ہو رہی ہے۔ جن قدر دانوں کو ہماری پہلی کتاب میں تازگی، زندہ دلی اور جواں سالی کا عکس نظر آیا، ان کو دوسری

میں کہولت کے آثار دکھلائی دیں۔ اس کی وجہ ہمیں تو یہی معلوم ہوتی ہے کہ ان کی عمر میں آٹھ سال کا اضافہ ہو چکا ہے۔

انسان کو حیوان ظریف کہا گیا ہے لیکن یہ حیوانوں کے ساتھ بڑی زیادتی ہے۔ اس لیے کہ دیکھا جاے تو انسان واحد حیوان ہے جو مصیبت پڑنے سے پہلے مایوس ہو جاتا ہے۔
انسان واحد جاندار ہے جسے خلاق عالم نے اپنے حال پر رونے کے لئے غدود گریہ بخشے ہیں۔
کثرت استعمال سے یہ بڑھ جائیں تو حساس طنز نگار دنیا سے یوں خفا ہو جاتے ہیں جیسے اگلے وقتوں میں آقا نمک حرام لونڈیوں سے روٹھ جایا کرتے تھے۔ لغزش غیر پر انہیں ہنسی کے بجائے طیش آ جاتا ہے۔ ذہین لوگوں کی ایک قسم وہ بھی ہے جو احمقوں کا وجود دوسرے سے برداشت ہی نہیں کر سکتی۔ لیکن' جیسا کہ مارکوئس دیبی سید نے کہا تھا' وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ سبھی انسان احمق ہوتے ہیں۔ موصوف نے تو یہ مشورہ دیا بھی دیا ہے کہ اگر تم واقعی کسی احمق کی صورت نہیں دیکھنا چاہتے تو خود کو اپنے کمرے میں مقفل کر لو اور آئینہ توڑ کر پھینک دو۔
لیکن مزاح نگار کے لیے نصیحت' فصیحت اور فہمائش حرام ہیں۔ وہ اپنا اور تلخ حقائق کی درمیان ایک قد آدم دیوار قہقہہ کھڑی کر لیتا ہے۔ وہ اپنا روئے خنداں' سورج مکھی پھول کی مانند ہمیشہ سرچشمہ نور کی جانب رکھتا ہے اور جب اس کا سورج ڈوب جاتا ہے تو اپنا رخ اس سمت کر لیتا ہے جدھر سے وہ پھر طلوع ہو گا۔

همه آفتاب بینم' همه آفتاب گویم
نه شبم' نه شب پرستم که حدیث خواب گویم

حس مزاح ہی دراصل انسان کی چھٹی حس ہے۔ یہ ہو تو انسان ہر مقام سے آسان گزر جاتا ہے۔

بے نشہ کس کو طاقت آشوب آگہی

یوں تو مزاح' مذہب اور الکحل ہر چیز میں باآسانی حل ہو جاتے ہیں' بالخصوص اردو ادب میں۔ لیکن مزاح کے اپنے تقاضے' اپنے ادب آداب ہیں۔ شرط اول یہ کہ برہمی' بیزاری اور کدورت دل میں راہ نہ پائے۔ ورنہ یہ بومرنگ پلٹ کر خود شکاری کا کام تمام کر دیتا ہے۔ مزا تو جب ہے کہ آگ بھی لگے اور کوئی انگلی نہ اٹھا سکے کہ "یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے؟" مزاح نگار اس وقت تک تبسم زیر لب کا سزا وار نہیں' جب تک اس نے دنیا اور اہل دنیا سے رج کے پیار نہ کیا ہو۔ ان سے' ان کی بے مہری و کم نگاہی سے۔ ان کی سرخوشی و ہوشیاری سے۔ ان کی تر دامنی اور تقدس سے۔ ایک پیمبر کے دامن پر پڑنے والا ہاتھ گستاخ ضرور ہے' مگر مشتاق و آرزو مند بھی ہے۔ یہ زلیخا کا ہاتھ ہے۔ خواب کو چھو کر دیکھنے والا ہاتھ۔

صبا کے ہاتھ میں نرمی ہے ان کے ہاتھوں کی

ایک صاحب طرز ادیب نے' جو سخن فہم ہونے کے علاوہ ہمارے طرفدار بھی ہیں (تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ سود خوار ہوتا..... کی حد تک) ایک رسالے میں دبی زبان سے یہ شکوہ کیا کہ ہماری شوخی تحریر مسائل حاضرہ کے عکس اور سیاسی سوز و گداز سے عاری ہے۔ اپنی صفائی میں مختصراً اتنا ہی عرض کریں گے کہ طعن و تشنیع سے اگر دوسروں کی اصلاح ہو جاتی تو بارود ایجاد کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ مولانا رومی کہ رمز و کنایہ میں سب کچھ کہہ جاتے ہیں' ایک اندھیری رات کی بات سناتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ جنگل بیابان میں ایک بچہ اپنی ماں سے چمٹ کر کہنے لگا کہ امی! اندھیرے میں مجھے ایک کالا دیو نظر آتا ہے اور مارے ڈر کے میری تو گھگی بندھ جاتی ہے۔ ماں نے جواب دیا' بیٹا! تو مرد بچہ ہے۔ خوف کو دل سے نکال دے۔ اب کی دفعہ جیسے ہی

وہ دکھائی دے، آگے بڑھ کر حملہ کر دینا۔ وہیں پتا چل جائے گا کہ حقیقت ہے یا محض تیرا وہم۔ بچے نے پوچھا، امی! اگر کالے دیو کی امی نے بھی اسے یہی نصیحت کر رکھی ہو تو...؟

کچھ علاج اس کا بھی اے شیشہ گراں ہے کہ نہیں؟

کچھ دن بعد وہ رسالہ کہ سرخیل دانشوراں تھا اور جس میں راقم الحروف کی سیاسی بے حسی و بے رغبتی کی تشخیص کی گئی تھی، نواب کالا باغ کے حکم سے بند کر دیا گیا۔

ہمارے قدر دان نے ایک پی ڈبلیو ڈی کے ٹھیکیدار کے ہاں بحیثیت پبلسٹی مینجر ملازمت کر لی۔ فقیر نے بھی یاران نامہرباں اور شہر بے اماں سے رخصت چاہی اور بوریا بدھنا سنبھال، داتا کی نگری کی راہ لی۔ "او بصحرا رفت و ما در کوچہ ہا رسوا شدیم"

"پروفیسر" "بارے آلو کا کچھ بیاں ہو جائے" اور "بائی فوکل کلب" اسی سفر شوق کی یادگار ہیں۔ پڑھنے والوں کا ان کا رنگ مختلف نظر آئے تو یہ زندہ دلان لاہور کا فیضان صحبت ہے۔

لوگ کیوں، کب اور کیسے ہنستے ہیں؟ جس دن ان سوالوں کا صحیح صحیح جواب معلوم ہو جائے گا، انسان ہنسنا چھوڑ دے گا۔ رہا یہ سوال کہ کس پر ہنستے ہیں؟ تو اس کا انحصار حکومت کی تاب و رواداری پر ہے۔ انگریز صرف ان چیزوں پر ہنستے ہیں، جو ان کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ پنچ کے لطیفے، موسم، عورت، تجریدی آرٹ۔ سے اس کے برعکس ہم لوگ ان چیزوں پر ہنستے ہیں جو اب ہماری سمجھ میں آ گئی ہیں۔

مثلاً انگریز' عشقیہ شاعری' روپیہ کمانے کی ترکیبیں' بنیادی جمہوریت۔
فقیر کی گالی' عورت کے تھپڑ اور مسخرے کی بات سے آزردہ نہیں ہونا چاہیے۔ یہ قول فیصل ہمارا نہیں' مولانا عبید زاکانی کا ہے۔ (از دشنام گدایاں و سیلی زناں و زبان شاعراں و مسخرگاں مرنجید) مزاہ نگار اس لحاظ سے بھی فائدے میں رہتا ہے کہ اس کی فاش سے فاش غلطی کے بارے میں بھی پڑھنے والے کو یہ اندیشہ لگا رہا ہے کہ ممکن ہے' اس میں بھی تفنن کا کوئی لطیف پہلو پوشیدہ ہو' جو غالباً موسم کی خرابی کے سبب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا۔ اس بنیادی حق سے دستبردار ہوئے بغیر' یہ تسلیم کر لینے میں چنداں مضائقہ نہیں کے ہم زبان اور قواعد کی پابندی کو تکلف زائد تصور نہیں کرتے۔ یہ اعتراف عجز اس لیے اور بھی ضروری ہے کہ آج کل بعض اہل قلم بڑی کوشش اور کاوش سے غلط زبان لکھ رہے ہیں۔ ہاں' کبھی کبھار بے دھیانی یا محض آلکس میں صحیح زبان لکھ جائیں تو اور بات ہے۔ بھول چوک کس سے نہیں ہوتی؟
محترم و مکرم جناب شان الحق صاحب حقی نے جس توجہ اور محبت سے اس مجموعے کے پانچ مضامین کا مطالعہ فرمایا اس کے لیے راقم الحروف ہمہ تن سپاس ہے۔ انہوں نے نہ صرف مفید مشوروں سے سرفراز فرمایا' بلکہ یہ کہہ کر مصنف کا دل بڑھایا کہ آپ کہیں کہیں گھسے پٹے محاورے استعمال کر جاتے ہیں' مگر آپ کا املا بے حد "اوریجنل" ہے۔ چنانچہ مبدا' کو مبد' پرواہ کو پروا اور وطیرہ کو وتیرہ لکھنا ہم نے انہی سے سیکھا۔ اور یہ بھی انہی سے معلوم ہوا کہ عطائی اور طوطا کا صحیح املا اتائی اور توتا ہے۔ جوش اصلاح میں ہم تو طوائف کو بھی ت سے لکھنے پر طیار تھے۔ مگر طوطے والی بات دل کو نہیں لگی۔ اس لیے کہ توتے کو اگر ط سے لکھا جائے تو نہ صرف یہ کہ زیادہ ہرا معلوم ہوتا ہے' بلکہ ط کا دائرہ ذرا ڈھنگ سے بنائیں تو چونچ بھی نظر آنے لگتی ہے۔ اور جھوٹ کیوں بولیں' طوائف الملوکی کا صحیح مفہوم بھی حقی صاحب ہی نے بتایا' ورنہ ہم تو کچھ اور سمجھے بیٹھے تھے۔ عربی فارسی میں بس اتنی شد بد ہے کہ میٹرک تک

ہم ایضاً کو کسی بسیار گو شاعر کا تخلص سمجھ کر ہر غزل ایضاً پر اپنا خون کھولاتے رہے۔
یادش بخیر! راہ زن کے لغوی معنی مرزا نے اسی زمانے میں زن بازاری بتائے تھے۔

اور سچ تو یہ ہے کہ جب سے اس کے صحیح معنی معلوم ہوئے ہیں' غالب اور آتش کے مصرعوں ہو کر اسیر دابتے ہیں راہ زن کے پانوں اور ہزار رہ زن امیدوار راہ میں ہے' کا سارا لطف ہی جاتا رہا۔ اب کہاں سے لاؤں وہ ناواقفیت کے مزے؟
از بسکہ حقی صاحب تحقیق کے مرد میداں ہیں' انہیں قدیم الفاظ و واقعات کے علاوہ کوئی اور بات مشکل سے یاد رہتی ہے۔ مثلاً وہ یہ فوراً بتا دیں گے کہ تیئں کب متروک ہوا۔ استاد (غالب) کے کلام میں' آئینہ کتنی مرتبہ آیا ہے۔ ستم پیشہ ڈومنی نے مغل بچہ کو کس سن میں داغ مفارقت دیا۔ استاد کے مکان کا پتہ اور بقایا کرایہ کیا تھا۔ لیکن اپنے مکان کا نمبر بتانے کے لیے انہیں بیگم سے تبادلہ شکوک کرنا پڑتا ہے۔ وہ خود بھی اپنی غیر حاضری دماغی کے لطیفوں کو سکھوں کے سمجھ کر' خوب محظوظ ہوتے ہیں۔
ایک دن The Absent - Minded Professor فلم کی پیشگی بکنگ کے "کیو" میں ملاقات ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد ہم دنوں کیو سے اس پر بحث کرتے ہوئے گتھم گتھا نکلے' بلکہ نکالے گئے کہ صحیح لفظ قمیض ہے یا قمیص۔ مرزا سے رجوع کیا تو فرمایا' صحیح پہناوا بشرٹ ہے۔ باہر نکلے تو ہم نے اپنی کار کا دروازہ کھولا اور حقی صاحب شکریہ ادا کرتے ہوئے داخل ہو گئے۔ داخل ہی نہیں ہوئے بلکہ اسٹیرنگ وہیل سنبھال لیا۔ اپنے کوٹ کی اندرونی و بیرونی جیبوں کو کھنگالنے کے بعد ہاتھ کی اتفاقی رگڑ سے ہماری پتلون کی جیب کو بھی ٹٹول لیا۔ بالآخر اپنے (اپنی) قمیص (قمیض) کی جیب سے ایک چابی برآمد کی۔ پورا زور لگانے کے باوجود یہ چابی نہ لگی تو فرمایا کہ اس ناہنجار ڈرائیور کو ہزار بار کہہ چکا ہوں کہ کسی اور ورکشاپ میں سروس کرائے جب بھی سروس ہوتی ہے' ایک نئی خرابی پیدا ہو جاتی ہے۔ ہم نے ہمت کرکے عرض کیا' قصور دراصل ہماری کار کے سوراخ کا ہے' جو آپ کی چابی میں فٹ نہیں ہو رہا۔ چمک کر بولے' ہاں! قصور

پر خوب یاد آیا۔ آپ نے ایک جگہ فوتید گی لکھا ہے۔ یہ مار واڑیوں کی سی اردو آپ نے کہاں سے سیکھی؟ عرض کیا' ماروواڑ میں' جہاں ہم پیدا ہوئے۔ ہمیں کار سے اتار کر فٹ پاتھ پر گلے لگاتے ہوئے بولے' تو گویا اردو آپ کی مادری زبان نہیں ہے۔

حالانکہ آپ کی اہلیہ تو اہل زبان ہیں۔

خدا انہیں خوش رکھے کہ انھوں نے ہماری اردو کی نوک پلک سنوارنے میں ہماری بیگم کا ہاتھ بٹایا ہے۔ (۲۴ اکتوبر ۱۹۶۹ء)

○○○

- صبغے اینڈ سنز

یہ اس پر امید زمانے کا ذکر ہے جب انہیں کتابوں کی دکان کھولے اور ڈیل کارنیگی پڑھے دو تین مہینے ہوئے ہوں گے اور جب ان کے ہونٹوں پر ہر وقت وہ ڈھلی منجھی مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی جو آج کل صرف ٹوتھ پیسٹ کے اشتہاروں میں نظر آتی ہے۔

اس زمانے میں ان کی باتوں میں وہ اڑ کر لگنے والا جوش اور ولولہ تھا جو بالعموم انجام سے بے خبر سٹے بازوں اور نو مسلموں سے منسوب کیا جاتا ہے۔
دکان کیا تھی کسی بگڑے ہوئے رئیس کی لائبریری تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ انہوں نے چن چن کر وہی کتابیں دکان میں رکھی ہیں جو خود ان کی پسند تھیں اور جن کے متعلق انہوں نے ہر طرح اپنا اطمینان کر لیا تھا کہ بازار میں ان کی کوئی مانگ ہے نہ کھپت۔
ہمارے دوست مرزا عبدالودود بیگ نے دکان میں قدم رکھتے ہی اپنی تمام ناپسندیدہ کتابیں اس خوش سلیقگی سے یکجا دیکھیں تو ایک دفعہ اپنی پرانی عینک پر اعتبار نہیں آیا اور جب اعتبار آ گیا تو الٹا پیار آنے لگا۔ اپنے مخصوص کھٹ مٹھے لہجے میں بولے "یار! اگر عام پسند کی بھی دو چار کتابیں رکھ لیتے تو گاہک دکان سے اس طرح نہ جاتے جیسے سکندر دنیا سے گیا تھا..... دونوں ہاتھ خالی۔
تاجرانہ تبسم کے بعد فرمایا "میں صرف معیاری کتابیں بیچتا ہوں۔"
پوچھا "معیار کی کیا پہچان؟"
ارشاد ہوا "سنو' میرے ایک قریبی ہمسائے ہیں' پروفیسر قاضی عبدالقدوس۔ چوبیس گھنٹے کتابوں میں جٹے رہتے ہیں۔ لہٰذا میں نے کیا یہ کہ دکان کھولنے سے پہلے ان سے ان کی اپنی پسندیدہ کتابوں کی فہرست بنوا لی۔ پھر ان کتابوں کو چھوڑ کر' اردو کی بقیہ تمام کتابیں خرید کے دکان میں سجا دیں۔ اب اس سے بہتر انتخاب کوئی کرکے دکھاوے۔"
پھر ایکاایکی تاجرانہ لہجہ بنا کر صیغہ جمع میں بنکارے "ہماری کتابیں' اردو ادب کی آبرو

ہیں۔"

"اور ہم یہ بہت ارزاں بیچتے ہیں۔" مرزا نے اسی لہجہ میں جملہ پورا کیا۔

مصیبت یہ تھی کہ ہر کتاب ہر مصنف کے متعلق ان کی اپنی رائے تھی۔ بے لاگ اور اٹل' جس کا اظہار و اعلان بالجہر وہ بمنزلہ دینی فرض سمجھتے تھے۔ چنانچہ بار ہا ایسا ہوا کہ انہوں نے گاہک کو کتاب خریدنے سے جبراً باز رکھا کہ اس سے اس کا ادبی ذوق خراب تر ہونے کا اندیشہ تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ کتب فروش کم اور کتب نما زیادہ تھے۔ کبھی کوئی خریدار ہلکی پھلکی کتاب مانگ بیٹھتا تو بڑی شفقت سے جواب دیتے "یہاں سے دو گلیاں چھوڑ کر سیدھے ہاتھ کو مڑ جایئے۔ پرلے نکڑ پر چوڑیوں کی دکان کے پاس ایک لیٹر بکس نظر آئے گا۔ اس کے ٹھیک سامنے جو اونچی سی دکان ہے۔ بچوں کی کتابیں وہیں ملتی ہیں۔" ایک مرتبہ کا واقعہ اب تک یاد ہے کہ ایک صاحب کلیات مومن پوچھتے ہوئے آئے اور چند منٹ بعد مولوی محمد اسماعیل میرٹھی مرحوم کی نظموں کا گلدستہ ہاتھ میں لیے ان کی دکان سے نکلے۔

ایک دن میں نے پوچھا اختر شیرانی کی کتابیں کیوں نہیں رکھتے؟ مسکرائے۔ فرمایا' وہ نابالغ شاعر ہے۔ میں سمجھا شاید Minor Poet کا وہ یہی مطلب سمجھتے ہیں۔ میری حیرانی دیکھ کر خود ہی وضاحت فرما دی کہ وہ وصل کی اس طور پر فرمائش کرتا ہے گویا کوئی بچہ ٹافی مانگ رہا ہے۔ اس پر میں نے اپنے ایک محبوب شاعر کا نام لے کر کہا کہ بیچارے ہوش خلیج آبادی نے کیا خطا کی ہے؟ ان کے مجموعے بھی نظر نہیں آتے۔ ارشاد ہوا کہ اس ظالم کے تقاضائے وصل کے یہ تیور ہیں گویا کوئی کابلی پٹھان ڈانٹ ڈانٹ کر ڈوبی ہوئی رقم وصول کر رہا ہے۔ میں نے کہا مگر وہ زبان کے بادشاہ ہیں۔ بولے ٹھیک کہتے ہو۔ زبان ان کے گھر کی لونڈی ہے اور وہ اس کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرتے ہیں۔ عاجز ہو کر میں نے کہا' اچھا یوں ہی سہی مگر فانی بدایونی کیوں غائب ہیں؟ فرمایا ہش! وہ نرے مصور غم ہیں تو مہدی مصور بنت عم۔ واللہ' وہ انشائیہ نہیں' نسائیہ لکھتے ہیں۔ بالآخر میں نے ایک جانے پہچانے پروفیسر نقاد کا نام لیا' مگر پتہ چلا کہ انہوں نے

اپنے کانوں سے فاضل پروفیسر کے والد بزرگوار کو لکھنؤ کو نکھلئو اور مزاج شریف کو مجاز شریف کہتے سنا تھا۔ چنانچہ اس پدرانہ نااہلی کی بنا پر ان کے تنقیدی مضامین دکان میں کبھی بار نہ پا سکے۔ یہی نہیں' خود پروفیسر موصوف نے ایک محفل میں ان کے سامنے غالب کا ایک مشہور شعر غلط پڑھا اور دوہرے ہو ہو کر داد وصول کی' سو الگ! میں نے کہا اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ بولے' فرق کی ایک ہی رہی۔ میرن صاحب کا قصہ بھول گئے؟ کسی نے ان کے سامنے غالب کا شعر غلط پڑھ دیا۔ تیوریاں چڑھا کر بولے' میاں! یہ کوئی قرآن و حدیث ہے۔ جیسے چاہا' پڑھ دیا۔

آپ نے ملاحظہ فرما لیا کہ بہت سی کتابیں وہ اس لیے نہیں رکھتے تھے کہ ان کو سخت ناپسند تھیں اور ان کے مصنفین سے وہ کسی نہ کسی موضوع پر ذاتی اختلاف رکھتے تھے لیکن معدودے چند مصنفین جو اس معتوب و مغضوب زمرے سے خارج تھے' ان کی کتابیں دکان میں رکھتے ضرور تھے' مگر کوشش یہی ہوتی کہ کسی طرح بکنے نہ پائیں' کیونکہ وہ انہیں بے حد پسند تھیں اور انہیں سنگوا سنگوا کر رکھنے میں عجیب روحانی لذت محسوس کرتے تھے۔ پسند و ناپسند کی اس غیر تاجرانہ کشاکش کا نتیجہ یہ نکلا کہ "کتب از جا نہ جنبند" سنئے سنائی نہیں کہتا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ دیوان غالب (مصور) دکان میں مہینوں پڑا رہا۔ محض اس وجہ سے کہ ان کا خیال تھا کہ دکان اس کے بغیر سونی سونی معلوم ہو گی۔ مرزا کہا کرتے تھے کہ ان کی مثال اس بدنصیب قصاب کی سی ہے۔ جسے بکروں سے عشق ہو جائے۔

کتابوں سے عشق کا یہ حال تھا کہ عین بوہنی اور بکری کے اوقات میں بھی مطالعے میں کمر کمر غرق رہتے۔ یہ کمر کمر کی قید اس لیے لگانا پڑی کہ ہم نے آج تک انہیں کوئی کتاب پوری پڑھتے نہیں دیکھا۔ مرزا اسی بات کو یوں کہتے تھے کہ بہت کم کتابیں ایسی ہیں جو اپنے کو ان سے پڑھوا سکی ہیں۔ یہی نہیں' اپنے مطالعے کی تکنیک کے مطابق رومانوی اور جاسوسی ناولوں کو ہمیشہ الٹا یعنی آخر سے پڑھتے تا کہ ہیروئین کا حشر اور

قاتل کا نام فوراً معلوم ہو جائے (ان کا قول ہے کہ معیاری ناول وہی ہے جو اس طرح پڑھنے پر بھی آخر سے شروع تک دلچسپ ہو) ہر کہیں سے دو تین صفحے الٹ پلٹ کر پوری کتاب کے متعلق بے دریغ رائے قائم کر لینا اور پھر اسے منوانا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ بعض اوقات تو لکھائی چھپائی دیکھ کر ہی ساری کتاب کا مضمون بھانپ لیتے۔ مجھے یاد ہے کہ اردو کی ایک تازہ چھپی ہوئی کتاب کا کاغذ اور روشنائی سونگھ کر نہ صرف اسے پڑھنے بلکہ دکان میں رکھنے سے بھی انکار کر دیا۔ ان کے دشمنوں نے اڑا رکھی تھی کہ وہ کتاب کا سرورق پڑھتے پڑھتے اونگھنے لگتے ہیں اور اس عالم کشف میں جو کچھ دماغ میں آتا ہے' اس کو مصنف سے منسوب کرکے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس سے بیزار ہو جاتے ہیں۔

اور مصنف غریب کس شمار قطار میں ہیں۔ اپنے ادبی قیاس و قیافے کا ذکر کرتے ہوئے ایک دن یہاں تک ڈینگ مارنے لگے کہ میں آدمی کی چال سے بتا سکتا ہوں کہ وہ کس قسم کی کتابیں پڑھتا رہا ہے۔ اتفاق سے اس وقت ایک بھرے بھرے پچھائے والی لڑکی دکان کے سامنے سے گزری۔ چینی قمیض اس کے بدن پر چست فقرے کی طرح کسی ہوئی تھی۔ سر پر ایک ربن سلیقے سے اوڑھے ہوئے' جسے میں ہی کیا' کوئی بھی شریف آدمی دوپٹہ نہیں کہہ سکتا۔ اس لیے کہ دوپٹہ کبھی اتنا بھلا معلوم نہیں ہوتا۔ تنگ موری اور تنگ تر گھیر کی شلوار۔ چال اگرچہ کڑی کمان کا تیر نہ تھی' لیکن کہیں زیادہ مہلک۔ کمان کتنی بھی اتری ہوئی کیوں نہ ہو' تیر لا محالہ سیدھا ہی آئے گا۔ ٹھک ٹھک کر نہیں' لیکن وہ قتالہ عالم قدم آگے بڑھانے سے پہلے ایک دفعہ جسم کے درمیانی حصے کو گھنٹے کے پنڈولم کی طرح دائیں بائیں یوں ہلاتی کہ بس چھری سی چل جاتی۔ نتیجہ یہ متذکرہ حصہ جسم نے جتنی مسافت جنوب سے شمال تک طے کی' اتنی ہی مشرق سے مغرب تک۔ مختصر یوں سمجھئے کہ ہر گام پر ایک قد آدم صلیب بناتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔

"اچھا بتاؤ' اس کی چومکھی چال سے کیا ٹپکتا ہے؟" میں نے پوچھا۔
"اس کی چال سے تو بس اس کا چال چلن ٹپکے ہے۔" مجھے آنکھ مار کر لہکتے ہوئے بولے۔

"پھر وہی بات! چال سے بتاؤ' کیسی کتابیں پڑھتی ہے؟" میں نے بھی پیچھا نہیں چھوڑا۔
"پگلے! یہ تو خود ایک کتاب ہے۔" انہوں نے شہادت کی انگلی سے سڑک پر ان خوانندگان کی طرف اشارہ کیا جو ایک فرلانگ سے اس کے پیچھے پیچھے فہرست مضامین کا مطالعہ کرتے چلے آ رہے تھے۔

دیکھا گیا ہے کہ وہی کتب فروش کامیاب ہوتے ہیں جو کتاب کے نام اور قیمت کے علاوہ اور کچھ جاننے کی کوشش نہیں کرتے۔ کیونکہ ان کی ناواقفیت عامہ جس قدر وسیع ہو گی' جس قدر عمیق اور متنوع ہو گی' اتنی ہی بھرپور خود اعتمادی اور معصوم گمراہی کے ساتھ وہ بری کتاب کو اچھا کرکے بیچ سکیں گے۔ اس کے برعکس کتابیں پڑھتے پڑھتے (ادھوری ہی سہی) ہمارے ہیرو کو اسلامی ناولوں کے جوشیلے مکالمے حفظ ہو گئے تھے اور بغدادی جم خانے میں کبھی دیسی وہسکی کی زیادتی سے موصوف پر ہذیانی کیفیت طاری ہو جاتی تو دشمنان اسلام پر گھونسے تان تان کر تڑاق پڑاق ایسے ڈائیلاگ بولتے' جن سے شوق شہادت اس طرح ٹپکا پڑتا تھا کہ بیروں تک کا ایمان تازہ ہو جاتا۔

مسلسل ورق گردانی کے سبب نئی نویلی کتابیں اپنی کنواری کراری مہک اور جلد کی کساوٹ کھو چکی تھیں۔ بیشتر صفحات کے کونے کتے کے کانوں کی طرح مڑ گئے تھے اور بعض پسندیدہ اوراق کی یہ کیفیت تھی کہ

جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر گزرا

اور لشکر بھی وہ جو خون کی بجائے پیک کی چھینٹیں اڑاتا ہوا گزر جائے۔ ایک مرتبہ ان کو بھری دکان میں اپنے ہی سائز کے ایک اسلامی ناول کا عطر نکالتے دیکھا تو مرزا نے ٹوکا۔ "لوگ اگر کسی حلوائی کو مٹھائی چکھتے دیکھ لیں تو

اس سے مٹھائی خریدنی چھوڑ دیتے ہیں اور ایک تم ہو کہ ہر آئے گئے کے سامنے کتب چشی کرتے رہتے ہو۔"

پھر کیا تھا' پہلے ہی بھرے بیٹھے تھے۔ پھٹ پڑے "کتب فروشی ایک علم ہے' برخوردار! ہمارے ہاں نیم جاہل کتابیں لکھ سکتے ہیں' مگر بیچنے کے لیے باخبر ہونا ضروری ہے۔ بعینہ اسی طرح جیسے ایک اندھا سرمہ بنا سکتا ہے' مگر بیچ بازار میں کھڑے ہو کر بیچ نہیں سکتا۔ میاں تم کیا جانو؟ کیسے کیسے جید جاہل سے پالا پڑتا ہے۔ (اپنی عزیز ترین کتاب کی جانب اشارہ کرتے ہوے) جی میں آتی ہے' دیوان غالب (مع مقدمہ مولانا امتیاز علی عرشی) ان کے سر پر دے ماروں۔ تمہیں یقین نہیں آئے گا۔ دو ہفتے ہونے کو آئے۔ ایک مظلوم صورت کلرک یہاں آیا اور مجھے اس کونے میں لے جا کر کچھ شرماتے' کچھ لجاتے ہوئے کہنے لگا کہ کرشن چندر ایم اے کی وہ کتاب چاہیے جس میں "تیری ماں کے دودھ میں حکم کا اکا" والی گالی ہے۔ خیر' اسے جانے دو کہ اس بیچارے کو دیکھ کر واقعی محسوس ہوتا تھا کہ یہ گالی سامنے رکھ کر ہی اس کی صورت بنائی گئی ہے۔ مگر ان صاحب کو کیا کہو گے جو نئے نئے اردو کے لیکچر مقرر ہوئے ہیں۔ میرے واقف کار ہیں۔ اسی مہینے کی پہلی تاریخ کو کالج سے پہلی تنخواہ وصول کرکے سیدھے یہاں آئے اور پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ لگے پوچھنے' صاحب! آپ کے ہاں منٹو کی وہ کتاب بھی ہے' جس میں "دھرن تختہ" کے معنے ہوں؟ اور ابھی پرسوں کا ذکر ہے۔ ایک محترمہ تشریف لائیں۔ سن یہی اٹھارہ انیس کا۔ نکلتا ہوا فربہ بدن' اپنی گڑیا کی چولی پہنے ہوئے تھیں۔ دونوں ہتھیلیوں کی رحل بنا کر اس پر اپنا کتابی چہرہ رکھا اور لگیں کتابوں کو ٹکر ٹکر دیکھنے۔ اسی جگہ جہاں تم کھڑے ہو۔ پھر دریافت کیا' کوئی ناول ہے؟ میں نے راتوں کی نیند حرام کرنے والا ایک ناول پیش کیا۔ رحل پر سے بولیں' یہ نہیں۔ کوئی ایسا دلچسپ ناول دیجئے کہ رات کو پڑھتے ہی نیند آ جائے۔ میں نے ایک ایسا ہی غشی آور ناول نکال کر دیا۔ مگر وہ بھی نہیں جچا۔ دراصل انہیں کسی گہرے سبز گرد پوش والی کتاب کی تلاش تھی' جو ان کی خواب گاہ کے سرخ پردوں سے "میچ" ہو

جائے۔ اس سخت معیار پر صرف ایک کتاب پوری اتری۔ وہ تھی "استاد موٹر ڈرائیوری"
(منظوم) جس کو دراصل اردو زبان میں خودکشی کی آسان ترکیبوں کا پہلا منظوم ہدایت

نامہ کہنا چاہیے۔

میں نے نوخیز خاتون کی حمایت کی "ہمارے ہاں اردو میں ایسی کتابیں بہت کم ہیں' جو
بغیر گرد پوش کے بھی اچھی لگیں۔ گرد پوش تو ایسا ہی ہے' جیسے عورت کے لیے کپڑے۔"

"مگر ہالی وڈ میں آج کل زیادہ تر ایکٹرسیں ایسی ہیں جو اگر کپڑے پہن لیں تو ذرا بھی
اچھی نہ لگیں۔" مرزا نے بات کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

لیکن نیا نیا شوق تھا اور ابھی یہ نوبت نہیں آئی تھی کہ ایسے واقعات سے ان کی طبیعت
سچ مچ مکدر ہو جائے۔ ڈیل کارنیگی کے مشورے کے مطابق وہ ہر وقت مسکراتے رہتے
اور ہم نے سوتے میں بھی ان کی باچھیں بطور خیر سگالی کھلی ہوئی ہی دیکھیں۔ اس زمانے
میں بقول مرزا' وہ چھوٹا دیکھتے نہ بڑا' ہر کس و ناکس کے ساتھ ڈیل کارنیگی کیا کرتے
تھے۔ حد یہ کہ ڈاکیا اگر بیرنگ خط بھی لاتا تو انعام و اکرام دے کر رخصت کرتے۔
گاہکوں کو تو ذاتی مہمان سمجھ کر بچھ بچھ جاتے اور اکثر متاع سخن کے ساتھ (اور کبھی
اس کے بغیر ہی) خود بھی بک جاتے۔ سچ ہے' خوش خلقی کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ چنانچہ
چند ہی دنوں میں دکان چل نکلی۔ مگر دکانداری ٹھپ ہو گئی۔ یہ صورت تضاد اس طرح
پیدا ہوئی کہ دکان پر اب ان قدر دانوں کی ریل پیل رہنے لگی جو اصل میں ان سے
کوکا کولا پینے یا فون کرنے آتے اور رو کن میں ایک آدھ کتاب عاریتاً لے کر ٹلتے۔
جس گاہک سے خصوصیت برتتے' اس کی پیشوائی کو بے تحاشا دوڑتے ہوئے سڑک کے
اس پار جاتے۔ پھر اسے اپنے اونچے سے اسٹول پر بٹھا کر فوراً دوسرے گاہک کو چالیس
قدم تک رخصت کرنے چلے جاتے۔ ہر دو رسوم کی پر تکلف ادائیگی کے دوران گاہک
کسی ایک گاہک یا گروہ کی اجتماعی تحویل میں رہتی۔ نتیجہ؟ کتابوں کی قطاروں میں جا
بجا کھانچے پڑ گئے۔ جیسے دانت ٹوٹ گئے ہوں۔ ان کے اپنے بیان کے مطابق ایک نئے

گاہک کو (جس نے ابھی ابھی "غبار خاطر" کا ایک نسخہ ادھار خریدا تھا) پاس والے ریستوران میں مصنف کی من بھاتی چینی چائے پلانے لے گئے۔ حلفیہ کہتے تھے کہ مشکل سے ایک گھنٹہ وہاں بیٹھا ہوں گا' مگر واپس آ کر دیکھا تو نوراللغات کی چوتھی جلد کی جگہ خالی تھی۔ ظاہر ہے کہ کسی بے ایمان نے موقع پاتے ہی ہاتھ صاف کر دیا۔ انہیں اس کی جگہ فسانہ آزاد کی چوتھی جلد رکھنا پڑی اور آخر کو یہی سیٹ چاکسو کالج لائبریری کو بذریعہ وی پی سپلائی کیا۔

چوریاں بڑھتی دیکھ کر ایک بزرگوار نے جو یوم افتتاح سے دکان پر اٹھتے بیٹھتے تھے' (بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ صرف بیٹھتے تھے' اس لیے کہ ہم نے ان کو کبھی اٹھتے نہیں دیکھا) مال کی ناجائز "نکاسی" روکنے کے لیے یہ تجویز پیش کی کہ ایک تعلیم یافتہ مگر ایمان دار مینیجر رکھ لیا جائے۔ ہر چند کہ ان کا روئے سخن اپنی ہی طرف تھا۔ لیکن ایک دوسرے صاحب نے (جو خیر سے صاحب دیوان تھے اور روزانہ اپنے دیوان کی بکری کا حال پوچھنے آتے اور اردو کے مستقبل سے مایوس ہو کر لوٹتے تھے) خود کو اس اسامی کے لیے پیش ہی نہیں کیا' بلکہ شام کو اپنے گھر واپس جانے سے بھی انکار کر دیا۔ یہی صاحب دوسرے دن سے خزانچی جی کہلائے جانے لگے۔ صورت سے سزا یافتہ معلوم ہوتے تھے اور اگر واقعی سزا یافتہ نہیں تھے تو یہ پولیس کی عین بھلمنساہٹ تھی۔ بہرحال یہاں ان کی ذات سے خیانت مجرمانہ کا کوئی خدشہ نہ تھا' کیونکہ دکان کی ساری بکری مدتوں سے ادھار پر ہو رہی تھی۔ یوں تو دکان میں پہلے ہی دن سے "آج نقد کل ادھار" کی ایک چھوڑ تین تین تختیاں لگی تھیں' مگر ہم دیکھتے چلے آئے تھے کہ وہ کل کا کام آج ہی کر ڈالنے کے قائل ہیں۔ پھر یہ کہ قرض پر کتابیں بیچنے پر ہی اکتفا کرتے تو صبر آ جاتا۔ لیکن آخر میں یہاں تک سننے میں آیا کہ بعض گاہک ان سے نقد روپے قرض لے کر پاس والی دکان سے کتابیں خریدنے لگے ہیں۔

میں موقع کی تلاش میں تھا' لہٰذا ایک دن تخلیہ پا کر انہیں سمجھایا کہ بندہ خدا اگر قرض

ہی دینا ہے تو بڑی رقم قرض دو تا کہ لینے والے کو یاد رہے اور تمہیں تقاضا کرنے میں شرم نہ آئے۔ یہ چھوٹے چھوٹے قرضے دے کر خلق خدا کے ایمان اور اپنے اخلاق کی آزمائش کاہے کو کرتے ہو؟ میری بات ان کے دل کو لگی۔ دوسرے ہی دن خزانچی جی سے نا دہندہ خریداروں کی مکمل فہرست حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب کرائی اور پھر خود اسی ترتیب سے ادھار وصول کرنے کا پنج روزہ منصوبہ بنا ڈالا' لیکن الف ہی کی ردیف میں ایک ایسا ناہنجار آن پڑا کہ چھ مہینے تک ب سے شروع ہونے والے ناموں کی باری نہیں آئی۔ میں نے یہ نقشہ دیکھا تو پھر سمجھایا کہ جب یہ حضرات تمہارے پاس حروف تہجی کی ترتیب سے قرض لینے نہیں آئے تو تم اس ترتیب سے وصول کرنے پر کیوں اڑے ہوئے ہو؟ سیدھی سی بات تھی مگر ہو منطق پر اتر آئے۔ کہنے لگے' اگر دوسرے بے اصول ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں بھی بے اصولا ہو جاؤں۔ دیکھتے نہیں' اسکول میں غیر حاضری کے وقت بچوں کے نام حروف تہجی کی ترتیب سے پکارے جاتے ہیں' مگر بچوں کو اسی ترتیب سے پیدا یا پاس ہونے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ بولتے کیوں نہیں؟"

اس کے باوجود میری نصیحت کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ اب کتاب ادھار نہیں بیچتے تھے' تحفتاً دیا کرتے تھے۔ کہتے تھے جب رقم ڈوبنی ہی ہے تو پھر ثواب سے بھی کیوں

محروم رہوں؟ ادھر کچھ عرصے سے انہوں نے بہی کھاتے لکھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ جس کا یہ معقول جواز پیش کرتے کہ میں نقصان مایہ میں جان کے زیاں کا اضافہ نہیں کرنا چاہتا۔ مرزا نے یہ لٹس مچتی دیکھی تو ایک دن پوچھا "آج کل تم حکومت کے فرائض کیوں انجام دے رہے ہو؟"

"کیا مطلب؟"

"تم نے قوم کی مفت تعلیم کا ذمہ کیوں لے رکھا ہے؟"

اب ان کے چہرے پر دانائی کی وہ چھوٹ پڑنے لگی جو عموماً دوالہ نکلنے کے بعد طلوع ہوتی

ہے۔ مرزا کا خیال ہے کہ جب تک دو تین دفعہ دوالہ نہ نکلے' آدمی کو دکانداری کا سلیقہ نہیں آتا۔ چنانچہ اس مبارک بربادی کے بعد وہ بجھ سے گئے اور ہر شے میں اپنی کمی محسوس کرنے لگے۔ وہ دائمی (Built-In) مسکراہٹ بھی غائب ہو گئی اور اب وہ بھول کر کسی گاہک سے سیدھے منہ بات نہیں کرتے تھے۔ مبادا وہ ادھار مانگ بیٹھے۔ اکثر دیکھا کہ جونہی گاہک نے دکان میں قدم رکھا اور انہوں نے گھرک کر پوچھا۔ "کیا چاہیے؟" ایک دن میں نے دڑبڑایا "اندھے کو بھی نظر آتا ہے کہ کتابوں کی دکان ہے' پھر تم کیوں پوچھتے ہو' کیا چاہیے۔" فرمایا "کیا کروں' بعضے بعضے کی صورت ہی ایسی ہوتی ہے کہ یہ پوچھنا پڑتا ہے۔"

کتابیں رکھنے کے گنہگار ضرور تھے' طوعاً و کرہاً بیچ بھی لیتے تھے "لیکن عیار طبع خریدار دیکھ کر"

ان کے نک چڑھے پن کا اندازہ اس واقعے سے ہو سکتا ہے کہ ایک دفعہ ایک شخص پوچھتا ہوا آیا "لغت ہے؟" لغت کا تلفظ اس نے لطف کے وزن پر کیا۔ انہوں نے نتھنے پھلا کر جواب دیا۔ "اسٹاک میں نہیں ہے۔" وہ چلا گیا تو میں نے کہا "یہ سامنے رکھی تو ہے' تم نے انکار کیوں کر دیا؟" کہنے لگے "یہ! یہ تو لغت ہے۔ پھر یہ بھی کہ اس بچارے کا کام ایک لغت سے تھوڑا ہی چلے گا۔" ہاں تلفظ پر یاد آیا کہ اس دور ابتلا میں انہوں نے دکان میں ایک ازکار رفتہ ریڈیو رکھ لیا تھا۔ اسی کو گود میں لیے گھنٹوں گڑگڑاہٹ سنا کرتے تھے' جسے وہ مختلف ملکوں کے موسم کا حال کہا کرتے تھے۔ بعد میں مرزا کی زبانی غایت سمع خراشی یہ معلوم ہوئی کہ اس ریڈیائی دمے کی بدولت کم از کم گاہکوں کی غلط اردو تو سنائی نہیں دیتی۔

یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ کتب فروشوں کو ہر کتاب پر اوسطاً تیس چالیس فیصد کمیشن ملتا ہے۔ بلا کد و کاوش۔ جس پیشے میں منافع کی یہ شرح عام ہو اس میں دوالہ نکالنے کے لیے غیر معمولی دل و دماغ درکار ہیں۔ اور وہ ایسے ہی دل و دماغ کے مالک نکلے۔ اپنی حسابی صلاحیتوں کا دستاویزی ثبوت وہ اس زمانے ہی میں دے چکے تھے' جب

سہ ماہی امتحان کی کاپی میں وہ اپنا نام "شیخ صبغت اللہ" لکھتے اور غیر سرکاری طور پر محض صبغے کہلاتے تھے۔ اسی زمانے سے وہ اپنے اس عقیدے پر سختی سے قائم ہیں کہ علم الحساب در حقیقت کسی متعصب کافر نے مسلمانوں کو آزار پہنچانے کے لیے ایجاد کیا تھا۔ چنانچہ ایک دن یہ خبر سن کر بڑی حیرت ہوئی کہ رات ان پر علم الحساب ہی کے کسی قاعدے کی رو سے یہ منکشف ہو گا۔ منافع کی یہ اندھا دھند شرح سن کر مرزا کے بھی منہ میں پانی بھر آیا۔ لہٰذا نزدیک ترین گلی سے صبغے کے پاس وہ گھوم کرنے پہنچے، جس کی مدد سے وہ بھی اپنی پرانے کوٹوں کی دکان میں تالہ ٹھوک کر فی الفور اپنے دلدر دور کر لیں۔

صبغے نے کان میں لگی ہوئی پنسل کی مدد سے اپنے فارمولے کی جو تشریح کی، اس کا لب لباب سلیس اردو میں یہ ہے کہ اب تک ان کا یہ معمول رہا کہ جس دن نئی کتابیں خرید کر دکان میں لگاتے، اسی دن ان پر ملنے والی چالیس فیصد منافع کا حساب (قریب ترین پائی تک) لگا کر خرچ کر ڈالتے۔ لیکن جب یہ کتابیں سال بھر تک دکان میں پڑی بھنکتی رہتیں تو "کرسمس سیل" میں ان گنج ہائے گراں مایہ کو پچاس فیصد رعایت پر فروخت کر ڈالتے اور اس طرح اپنے حساب کی رو سے ہر کتاب پر نوے فیصد ناجائز نقصان اٹھاتے۔ لیکن نیا فارمولا دریافت ہونے کے بعد اب وہ کتابیں یکسر فروخت ہی نہیں کریں گے، لہٰذا اپنی اس حکمت عملی سے نوے فیصد نقصان سے صاف بچ جائیں گے اور یہ منافع نیں تو کیا ہے؟

کتب فروشی کے آخری دور میں جب ان پر پیمبری وقت پڑا تو ہر ایک گاہک کو اپنا مالی دشمن تصور کرتے اور دکان سے اس کے خالی ہاتھ جانے کو اپنے حق میں باعث خیر و برکت گردانتے۔ ہفتے کو میرا دفتر ایک بجے بند ہو جاتا ہے۔ واپسی میں یوں ہی خیال آیا کہ چلو آج صبغے کی دکان میں جھانکتا چلوں۔ دیکھا کہ وہ اونچے سٹول پر پیر لٹکائے اپنے قرض داروں کی فہرستوں سے ٹیک لگائے سو رہے ہیں۔ میں نے کھنکار کر کہا۔

"قیلولہ....؟"

"اسٹاک میں نہیں ہے۔" آنکھیں بند کئے کئے بولے۔

یہ کہہ کر ذرا گردن اٹھائی۔ چندھیائی ہوئی آنکھوں سے اپنی داہنی ہتھیلی دیکھی اور پھر سو گئے۔

داہنی ہتھیلی دیکھنا ان کی بڑی پرانی عادت ہے جسے زمانہ طالب علمی کی یادگار کہنا چاہیے۔ ہوتا یہ تھا کہ دن بھر خوار و خستہ ہونے کے بعد وہ رات کو ہوسٹل میں کسی نہ کسی کے سر ہو جاتے کہ صبح تمہارا منہ دیکھا تھا۔ چنانچہ ان کے کمرے کے ساتھی اپنی بدنامی کے خوف سے صبح دس بجے تک لحاف اوڑھے پڑے رہتے اور کچھوے کی طرح گردن نکال نکال کر دیکھے رہتے کہ صبغے دفعان ہوئے یا نہیں۔ جب اپنے بیگانے سب آئے دن کی نحوستوں کی ذمہ داری لینے سے یوں منہ چھپانے لگے تو صبغے نے ایک ہندو نجومی کے مشورے سے یہ عادت ڈالی کہ صبح آنکھ کھلتے ہی شگون کے لیے اپنی دائیں ہتھیلی دیکھتے اور دن بھر اپنے آپ پر لعنت بھیجتے رہتے۔ پھر تو یہ عادت سی ہو گئی کہ نازک و فیصلہ کن لمحات میں مثلاً اخبار میں اپنا رول نمبر تلاش کرتے وقت تاش چھینٹنے کے بعد اور کرکٹ کی گیند پر ہٹ لگانے سے پہلے' ایک دفعہ اپنی داہنی ہتھیلی ضرور دیکھ لیتے تھے جس زمانے کا یہ ذکر ہے' ان دنوں ان کو اپنی ہتھیلی میں ایک حسینہ صاف نظر آ رہی تھی جس کا جہیز بمشکل ان کی ہتھیلی میں سما سکتا تھا۔

الماریوں کے ان گنت خانے جو کبھی ٹھسا ٹھس بھرے رہتے تھے' اب خالی ہو چکے تھے۔ جیسے کسی نے بھٹے کے دانے نکال لیے ہوں۔ مگر صبغے ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنے والے نہیں تھے۔ چنانچہ اکثر دیکھا کہ ظہر سے عصر تک شیشے کے شوکیس کی فرضی اوٹ میں اپنے خلیرے چچیرے بھائیوں کے ساتھ سر جوڑے فلش کھیلتے رہے۔ ان کا خیال تھا کہ جوا اگر قریبی رشتہ داروں کے ساتھ کھیلا جائے تو کم گناہ ہوتا ہے۔ رہی دکانداری تو وہ ان حالوں کو پہنچ گئی تھی کہ تاش کے پتوں کے سوا اب دکان میں کاغذ کی کوئی چیز نہیں بچی تھی۔ گاہکوں کی تعداد اگرچہ تگنی چوگنی ہو گئی' مگر مول تول کی نوعیت

قدرے مختلف ہوتے ہوتے جب یہ نوبت آ گئی کہ راہ چلنے والے بھی بھاؤ تاؤ کرنے لگے تو خزانچی جی نے خاکی گتے پر ایک نوٹس نہایت پاکیزہ خط میں آویزاں کر دیا۔

"یہ فرنیچر کی دکان نہیں ہے۔"

یاد رہے کہ ان کی نصف زندگی ان لوگوں نے تلخ کر دی تو قرض پر کتابیں لے جاتے تھے اور بقیہ نصف زندگی ان حضرات نے تلخ کر رکھی تھی جن سے وہ خود قرض لے بیٹھے تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان کی تباہی میں کچھ شائبہ خوبیِ تقدیر بھی تھا۔ قدرت نے ان کے ہاتھ میں کچھ ایسا جس دیا تھا کہ سونے کو ہاتھ لگائیں تو مٹی ہو جائے۔ لیکن انصاف سے دیکھا جائے تو ان کی بربادی کا سہرا قدرت کے علاوہ ان مہربانوں کے سر تھا جو انتہائی خلوص اور مستقل مزاجی کے ساتھ دامے درمے سخنے ان کو نقصان پہنچاتے رہے۔ دوسری وجہ جیسا کہ اوپر اشارہ کر چکا ہوں' یہ تھی کہ وہ اپنے خاص دوستوں سے اپنی حاجت اور ان کی حیثیت کے مطابق قرضہ لیتے رہے اور قرضے کو منافع سمجھ کر کھا گئے۔ بقول مرزا ان کا دل بڑا تھا اور قرض لینے میں انہوں نے کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ قرض پر لین دین ان کے مزاج میں اس حد تک رچ بس چکا تھا کہ مرزا کا خیال تھا کہ صبغے دراصل سہروردی حکومت کو کھکہ کرنے کی غرض سے اپنی آمدنی نہیں بڑھاتے۔ اس لیے کہ آمدنی بڑھے گی تو لا محالہ انکم ٹیکس بھی بڑھے گا۔ اب تو ان کی یہ تمنا ہے کہ بقیہ عمر عزیز بنک اور ڈرافٹ پر گوشہ بدنامی میں گزار دیں' لیکن ان کی نیت بری نہیں تھی۔ یہ اور بات ہے کہ حالات نے ان کی نیک نیتی کو ابھرنے نہ دیا۔ گزشتہ رمضان میں ملاقات ہوئی تو بہت اداس اور فکر مند پایا۔ بار بار پتلون کی جیب سے ید بیضا نکال کر دیکھ رہے تھے۔ پوچھا' صبغے کیا بات ہے؟ بولے ' کچھ نہیں۔ پروفیسر عبدالقدوس سے قرض لیے تیرہ سال ہونے کو آئے۔ آج یونہی بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ اب واپسی کی سبیل کرنی چاہیے' ورنہ وہ بھی دل میں سوچیں گے کہ شاید میں نادہندہ ہوں۔

جوانی میں خدا کے قائل نہیں تھے' مگر جیسے جیسے عمر بڑھتی گئی' ایمان پختہ ہوتا گیا۔ یہاں

تک کہ اب وہ اپنی تمام نالائقیوں کو سچے دل سے منجانب اللہ سمجھنے لگے تھے۔ طبیعت ہی ایسی پائی تھی کہ جب تک چھوٹی سے چھوٹی بات پر بڑی سے بڑی قربانی نہ دے دیتے' انہیں چین نہیں پڑتا تھا۔ بقول مرزا' ہو اناالحق کے بغیر سولی پر چڑھنا چاہتے تھے۔ تجارت کو انہوں نے وسیلہ معاش نہیں' حیلہ جہاد سمجھا اور بہت جلد شہادت کا درجہ پایا۔

دکان کی دیوار کا پلاسٹر ایک جگہ سے اکھڑ گیا تھا۔ اس مقام پر (جو تقریباً دو مربع گز تھا) انہوں نے ایک سرخ تختی جس پر ان کا فلسفہ حیات بخط نستعلیق کندہ تھا' ٹانگ دی۔

باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم

اس میں قطعی کوئی تعلی نہیں تھی' بلکہ دیکھا جائے تو انہوں نے کسر نفسی ہی سے کام لیا کیونکہ باطل تو باطل' وہ حق سے بھی دبنے والے نہیں تھے۔ مرزا اکثر نصیحت کرتے کہ میاں کامیابی چاہتے ہو تو کامیاب کتب فروشوں کی طرح بقدر ضرورت سچ بولو اور ہر کتاب کے حسن و قبح پر ضدم ضدا کرنے کی بجائے گاہکوں کو انہی کی پسند کی کتابوں سے برباد ہونے دو۔ جو بچارا تربوز سے بہل جائے اسے زبردستی انگور کیوں کھلاتے ہو؟ لیکن صبغے کا کہنا تھا کہ بیسویں صدی میں جیت انہی کی ہے' جن کے ہاتھ میں دین ہے اور دوسرے میں دنیا۔ اور دائیں ہاتھ کو خبر نہیں کہ بائیں میں کیا ہے۔ تجارت اور نجابت میں سنجوگ ممکن نہیں۔ تجارت میں فوری ناکامی ان کے نزدیک مقیاس الشرافت تھی۔ انہی کا مقولہ ہے کہ اگر کوئی شخص تجارت میں بہت جلد ناکام نہ ہو سکے۔ تو سمجھ لو کہ اس کے حسب نسب میں فی ہے۔ اس اعتبار سے انہوں نے قدم قدم پر' بلکہ ہر

سودے میں اپنی نسبی شرافت کا وافر ثبوت دیا۔
حساس آدمی تھے' اس پر بدقسمتی یہ کہ ایک ناکام کتب فروش کی حیثیت سے انہیں انسانوں کی فطرت کا بہت قریب سے مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ اسی لیے بہت جلد انسانیت سے مایوس ہو گئے۔ انھوں نے تمام عمر تکلیفیں ہی تکلیفیں اٹھائیں۔ شاید اسی وجہ سے انہیں یقین ہو چلا تھا کہ وہ حق پر ہیں۔ زندگی سے کب کے بیزار ہو چکے تھے اور ان کی باتوں سے ایسا لگتا تھا گویا اب محض اپنے قرض خواہوں کی تالیف قلوب کے لیے جی رہے ہیں۔ اب ہم ذیل میں وہ تاثرات و تعصبات مختصراً بیان کرتے ہیں جو ان کی چالیس سالہ ناتجربہ کاری کا نچوڑ ہیں۔
دکان کھولنے سے چار پانچ مہینے پہلے ایک ادبی خیر سگالی وفد (ادارہ برائے ترقی انجمن پسند مصنفین) کے ساتھ سیلون ہو آئے تھے' جسے حاسد لنکا کے نام سے یاد کرتے تھے۔ اس جزیرے کی سہ روزہ سیاحت کے بعد اٹھتے بیٹھتے "ترقی یافتہ ممالک" کی ادب نوازی و علم دوستی کے چرچے رہنے لگے۔ ایک دفعہ برادران وطن کی ناقدری کا گلہ کرتے ہوئے فرمایا۔ "آپ کے ہاں تو ابھی تک جہالت کی خرابیاں دور کرنے پر کتابیں لکھی جا رہی ہیں مگر ترقی یافتہ ممالک میں تو اب مارا ایسی کتابیں لکھی جا رہی ہیں' جن کا مقصد ان خرابیوں کو دور کرنا ہے جو محض جہالت دور ہونے سے پیدا ہو گئی ہیں۔ صاحب! وہاں علم کی ایسی قدر ہے کہ کتاب لکھنا' کتاب چھاپنا' کتاب بیچنا' کتاب خریدنا' حد یہ کہ کتاب چرانا بھی ثواب میں داخل ہے۔ یقین مانئے' ترقی یافتہ ممالک میں تو جاہل آدمی ٹھیک سے جرم بھی نہیں کر سکتا۔" شامت اعمال' میرے منہ سے نکل گیا۔ "یہ سب کہنے کی باتیں ہیں ترقی یافتہ ممالک میں کوئی کتاب اس وقت تک اچھی خیال نہیں کی جاتی' جب تک اس کی فلم نہ بن جائے اور فلم بننے کے بعد کتاب پڑھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" انہیں غصہ آ گیا "تین پیسے کی چھوکری" کا کونا موڑ کر واپس الماری میں رکھی اور میرے لب و لہجے کی ہو بہو نقل اتارتے ہوئے بولے۔ "اور آپ کے

ہاں یہ کیفیت ہے کہ نوجوان اس وقت تک اردو کی کوئی کتاب پڑھنے کی حاجت محسوس نہیں کرتے، جب تک پولیس اسے فحش قرار نہ دے دے۔ اور فحش قرار پانے کے بعد اس کے بیچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" ان کے طنز میں طعنے کا رنگ آ چلا تھا، اس لیے میں نے جھٹ سے حامی بھر لی کہ پولیس اگر دل سے چاہے تو تمام اچھی اچھی کتابوں کو فحش قرار دے کر نوجوانوں میں اردو ادب سے گہری دلچسپی پیدا کر سکتی ہے۔

میرے لہجے کا نوٹس نہ لیتے ہوئے الٹے مجھی سے الجھنے لگے کہ آپ بات کی تہہ تک نہیں پہنچے۔ آپ دھڑا دھڑ کتابیں چھاپ سکتے ہیں، مگر زبردستی پڑھوا نہیں سکتے۔ میں نے کہا، کیوں نہیں؟ اٹھا کے نصاب میں داخل کر دیجئے۔ وہ بھلا ہار ماننے والے تھے۔ کہنے لگے، اگر ایک پوری کی پوری نسل کو ہمیشہ کے لئے کسی اچھی کتاب سے بیزار کرنا ہو تو سیدھی ترکیب یہ ہے کہ اسے نصاب میں داخل کر دیجئے۔

کتب فروشی کی بدولت صبغے کا سابقہ ایسے ایسے پڑھنے اور نہ پڑھنے والوں سے پڑا۔ "ہزاروں سال نرگس جن کی بے نوری پہ روتی ہے"

ان میں خیام کے وہ دلدادہ بھی شامل تھے جو اصل رباعیوں میں ترجے خوبیوں تلاش کرتے پھرتے تھے۔ ان میں وہ سال خوردہ کتاب خواں بھی تھے جو کجلائے ہوئے کوئلوں کو دہکانے کے لئے بقول مرزا، عریاں ناولوں سے منہ کالا کرتے اور سمجھتے کہ ہم اردو کی عزت بڑھا رہے ہیں۔ (یہ قول انہی کا ہے کہ فحش کتاب میں دیمک نہیں لگ سکتی کیونکہ دیمک ایسا کاغذ کھا کر افزائش نسل کے قابل نہیں رہتی) ان میں وہ خوش نصیب بھی تھے، جن کے لئے کتاب بہترین رفیق ہے اور وہ کم نصیب بھی جن کے لیے واحد رفیق!

اور اس بے نام قبیلے میں وہ جدت پسند پڑھنے والے بھی شامل تھے جو ہر لحظہ تازہ بہ تازہ، نو بہ نو کے طلبگار رہتے۔ حالانکہ ان جیسوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ فقط ڈکشنری ہی ایک ایسی کتاب ہے جسے وہ جب بھی دیکھیں، انشاء اللہ نئی معلوم ہو گی۔ لیکن ایک

حد تک صبغے کی بھی زیادتی تھی کہ نئی اردو کتابوں کو اپنے دل اور دکان میں جگہ دینا تو بڑی بات ہے' چمٹے سے پکڑ کر بھی بیچنے کے لئے تیار نہ تھے۔ ایک دن خاقانی ہند استاد ذوق کے قصائد کی گرد ہفتہ وار ٹائم سے جھاڑتے ہوئے کٹکٹا کر کہنے لگے کہ آج کل لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ادب ایک "کیپ سول" میں بند کرکے ان کے حوالے کر دیا جائے' جسے وہ کوکا کولا کے گھونٹ کے ساتھ غٹک سے حلق اتار لیں۔ انسانی تہذیب پتھر اور بھوج پتر کے عہد سے گزر کر اب ریڈرز ڈائجسٹ کے دور تک آ گئی ہے۔ سمجھے؟ یہ مصنفوں کا دور نہیں' صحافیوں کا دور ہے! صحافیوں کا!

میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا "مگر صحافت میں کیا قباحت ہے؟"

بولے "کچھ نہیں' بڑا مصنف اپنی آواز پبلک تک پہنچاتا ہے' مگر بڑا صحافی پبلک کی آواز پبلک تک پہنچاتا ہے۔"

مصنفوں کا ذکر چھڑ گیا تو ایک واردات اور سنتے چلئے۔ سات آٹھ مہینے تک وہ اردو افسانوں کا ایک مجموعہ بیچتے رہے' جس کے سر ورق پر مصنف کے دستخط بقلم خود ثبت تھے اور اوپر یہ عبارت۔ "جس کتاب پر مصنف کے دستخط نہ ہوں وہ جعلی تصور کی جائے۔" ایک روز انہیں رجسٹری سے مصنف کے وکیل کی معرفت نوٹس ملا کہ ہمیں معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ آپ ہمارے موکل کی کتاب کا ایک مصدقہ ایڈیشن عرصہ آٹھ ماہ سے مبینہ طور پر فروخت کر رہے ہیں' جس پر مصنف مذکور کے دستخط بقید تاریخ ثبت ہیں۔ آپ کو بذریعہ نوٹس ہذا مطلع و متنبہ کیا جاتا ہے کہ محولہ بالا کتاب اور دستخط دونوں سراسر جعلی ہیں۔ اصل ایڈیشن میں مصنف کے دستخط سرے سے ہیں ہی نہیں۔

اس واقعے سے انہوں نے ایسی عبرت پکڑی کہ آئندہ کوئی ایسی کتاب دکان میں نہیں رکھی' جس پر کسی کے بھی دستخط ہوں۔ بلکہ جہاں تک بن پڑتا' انہی کتابوں کو ترجیح دیتے جن پر مصنف کا نام تک درج نہیں ہوتا۔ مثلاً الف لیلیٰ' ضابطہ فوجداری' ریلوے ٹائم ٹیبل' انجیل۔

تباہی کی جو طبغراد راہ بلکہ شاہراہ انہوں نے اپنے لیے نکالی' اس پر وہ تو کیا' قارون

بھی زیادہ دیر گامزن نہیں رہ سکتا تھا' کیونکہ منزل بہت دور نہیں تھی۔ آخر وہ دن آ ہی گیا' جس کا دشمنوں کا انتظار تھا اور دوستوں کو اندیشہ۔ دکان بند ہو گئی۔ خزانچی جی کی تنخواہ ڈھائی مہینے سے چڑھی ہوئی تھی۔ لہٰذا خالی الماریاں' ایک عدد گولک چوبی جو نادہندوں کی فہرستوں سے منہ تک بھری تھی۔ چاندی کا خوبصورت سگریٹ کیس' جسے کھولتے ہی محسوس ہوتا تھا گویا بیڑی کا بنڈل کھل گیا۔ نسینی' جس کی صرف اوپر کی تین سیڑھیاں باقی رہ گئی تھیں' خواب آور گولیوں کی شیشی' کراچی ریس میں دوڑنے والے گھوڑوں کے شجرہ ہائے نسب' نومبر سے دسمبر تک کا مکمل کیلنڈر کیل سمت۔ یہ سب خزانچی جی نے صبغے کی اولین غفلت میں ہتھیا لیے اور راتوں رات اپنی تنخواہ کی ایک ایک پائی گدھا گاڑی میں ڈھو ڈھو کر لے گئے۔ دوسرے دن دکان کا مالک بقایا کرائے کی مد میں جو جائیداد منقولہ و غیر منقولہ اٹھا کر یا اکھاڑ کر لے گیا' اس کی تفصیل کی یہاں نہ گنجائش ہے نہ ضرورت۔ ہمارے پڑھنے والوں کو بس اتنا اشارہ کافی ہو گا کہ ان میں سب سے قیمتی چیز بغیر چابی کے بند ہونے والا ایک قفل فولادی ساختہ جرمنی تھا۔ پرانا ضرور تھا' مگر ایک خوبی اس میں ایسی پیدا ہو گئی تھی جو ہم نے نئے سے نئے جرمن تالوں میں بھی نہیں دیکھی۔ یعنی بغیر چابی کے بند ہونا اور اسی طرح کھلنا۔

صبغے غریب کے حصے میں صرف اپنے نام (مع فرضی فرزندان) کا سائن بورڈ آیا' جس کو سات روپے مزدوری دے کر گھر اٹھوا لائے اور دوسرے دن سوا روپے میں محلے کے کباڑی کے ہاتھ فروخت کر ڈالا۔ مگر انھوں نے ہمت نہیں ہاری اور دو مہینے تک اپنی ہتھیلی کا شبانہ روز مطالعہ کرنے کے بعد ایک ٹریننگ کالج میں سکول ماسٹروں کو پڑھانا شروع کر دیا۔ مرزا کے الفاظ میں صبغے کی کتب فروشانہ زندگی کے باب کا انجام نہایت افسانوی رہا۔ جس افسانے کی طرف یہاں مرزا کا اشارہ ہے' وہ دراصل کائی لنگ کی ایک مشہور چینی کہانی ہے' جس کا ہیرو ایک آرٹسٹ ہے۔ ایک دن وہ اپنی ایک ماڈل لڑکی کی خوبصورتی سے اس قدر متاثر ہوا کہ اسی وقت اپنے سارے برش اور کینوس سمیٹ

سمٹ کر جلا ڈالے اور ایک سرکس میں ہاتھیوں کو سدھانے کا کام کرنے لگا۔

○○○

• سیزر، ماتا ہری اور مرزا

"ہائے اللہ! یہ ہاتھی کا ہاتھی کتا کاہے کو لے آئے؟"
"چوکیداری کے لیے۔"
"کس کی؟"
"گھر کی"
"اس گھر کی؟"
"ہاں! بہت ہی ہوشیار کتا ہے۔ گھر میں کچھ نہ ہو، تب بھی چوکیداری کر سکتا ہے۔"

اس ازدواجی مکالمے سے بعد میں یہ فائدہ ضرور ہوا کہ تنخواہ ملتے ہی ہم نے گھر گرہستی کا ضروری سامان خرید ڈالا تا کہ کتا اس کی چوکیداری کر سکے، لیکن والدین کی سمجھ میں آنے والا جو فوری فائدہ ہم نے سر دست بیان کیا، اس سے اپنے معصوم بچوں کو جان بوجھ کر محروم رکھنے کے لیے پتھر کا کلیجہ چاہیے۔ وہ فائدہ یہ تھا کہ آخر کو یہ ایک انگریز کا کتا تھا، اور یہ کون نہیں جانتا کہ ہمارے ہاں ان پڑھ سے ان پڑھ آدمی بھی اپنے کتے کا نام انگریزی رکھتا ہے اور انگریزی ہی میں اس سے بات چیت اور ڈانٹ ڈپٹ کرتا ہے۔ چنانچہ ہم نے اشارتاً توجہ دلائی کہ اس کی وجہ سے بچوں کو انگریزی بولنا آ جائے گی۔

یہ سنتے ہی بیگم نے کتے کے سر پر ہاتھ پھیرا اور زنجیر ایسے فیصلہ کن جھٹکے کے ساتھ ہمارے ہاتھ سے چھین لے، جیسے لیڈی میکبتھ نے میکبتھ کے ہاتھ سے خنجر چھینا تھا۔

Inform of Purpose!
Give me the Dagger...

یادش بخیر! اس ڈراپ سین سے کوئی بیس سال ادھر جب آتش جوان بلکہ نوجوان تھا، اس نے نیلی آنکھوں، بھری بھری ٹانگوں اور "بلونڈ" بالوں والی میم کو باغ میں اپنے جیبی سائز کے "پومرینین" کتے کو بھینچ بھینچ کر پیار کرتے دیکھا تھا۔ تھا بھی ظالم اس قابل۔

گول مٹول' جھبرا' سفید گالا سے بالوں سے سارا جسم اس بری طرح ڈھکا ہوا تھا کہ جب تک چلنا شروع نہ کرے' یہ بتانا مشکل تھا کہ منہ کس طرف ہے۔ ہائے! وہ بھی کیا زمانہ تھا جب ہر چیز جوان تھی۔ ہر چیز حسین تھی۔ ہر چیز پہ ٹوٹ کے پیار آتا تھا۔ کیسے مہکتے دہکتے دن تھے وہ بھی۔

مری سانس میں ہے گرمی کہ یہ لو سی چل رہی ہے

اچھی طرح یاد ہے کہ اس دن ان گنہگار آنکھوں کو زنجیر کے دونوں سروں پر حسن نظر آیا اور دل میں یہ پیار بھری حسرت کروٹیں لینے لگی کہ انگریز کی غلامی سے آزاد ہونے کے بعد کبھی فراغت اور گوشہ چمن نصیب ہوا تو ایک نیلی آنکھوں' بھری بھری ٹانگوں اور "بلونڈ" بالوں والا کتا ضرور پالیں گے۔ مگر ایک تو بقول مرزا اعلیٰ نسل کے کتے باوا کے مول ملتے ہیں۔ دوسرے' اس زمانے میں مکان اتنا تنگ تھا کہ جانور کا تندرست رہنا محال۔ وہ تو خدا بھلا کرے مسٹر ایس کے ڈین (شیخ خیر الدین) ایم اے (آکسن) کا' جو ہماری آتش شوق کو ہوا دیتے رہے۔ یہ ہمارے دور پرے کے عزیز ہمسائے تھے۔ ان کے پاس ایک بڑا جید کتا تھا۔ خالص "گرے ہاؤنڈ" جسے وہ پڑوسیوں کا خون پلا پلا کر پال رہے تھے' دہن رسا رکھتا تھا۔ جسم تتییے جیسا اور مزاج بھی ایضاً۔ یوں تو بھونکنے کے تمام متداول اصناف میں استادانہ مہارت رکھتا تھا' لیکن چاندنی چھٹکی ہو اور طبیعت حاضر' تو پھر کچھ ایسی "اوریجنل" طرز اختیار کرتا کہ جتنی مرتبہ بھونکتا' طبیعت کو ہر بار ایک نئی کوفت حاصل ہوتی۔ دیکھا گیا ہے کہ ایسے ویسے شوقیہ بھونکنے والے کتوں کا سانس تو دو

چار دفعہ ہی ٹیاؤں ٹیاؤں کرنے میں اکھڑ جاتا ہے۔ مگر یہ کتا بقول مرزا' اردو میں بھونکتا تھا' یعنی بھونکتا ہی چلا جاتا تھا۔ کہنے والے کہتے تھے کہ مسٹر ایس کے ڈین اپنے نج کے بزرگوں کو اپنے لائق نہیں سمجھتے۔ مگر اپنے اصیل کتے کا شجرہ نسب پندرھویں پشت تک فر فر سناتے اور اس کے آباء و اجداد پر اس طرح فخر کرتے' گویا ان کا خالص خون ان کی ناچیز رگوں میں دوڑ رہا ہے۔ کہتے تھے' نہر سویز کے اس طرف اتنا خالص و خونخوار کتا ڈھونڈے سے نہیں ملے گا۔ اس کا دادا پندرہ جون ۱۹۴۱ء کو پانڈیچری میں دیسی کتوں سے لڑتا ہوا مارا گیا۔ چاندنی رات' ہو ہو کا عالم' چوراہے پر گھمسان کا رن پڑا۔ کتوں کے پشتے لگ گئے تھے۔ محلے میں شور تھا کہ مسٹر ڈین کے ہاں کوئی گھبرایا گھبرایا فائر بریگیڈ کو فون کرنے بھی چلا جائے تو اسے اپنے مرحوم کتوں کے البم دکھائے بغیر فون کو ہاتھ نہیں لگانے دیتے۔ ڈرائنگ روم میں مسٹر ڈین کی ایک بڑی سی تصویر بھی ٹنگی تھی' جو انہوں نے اپنے کتے کے جیتے ہوئے کپ اور ٹرافیوں کے ساتھ کھڑے ہو کر اور اس کے تمغے کوٹ پر لگا کر کھنچوائی تھی۔ ہماری دیرینہ حسرت و شیفتگی کے پیش نظر ایک دن تخلیہ میں ہمیں اپنے ٹیپ ریکارڈ ز پر موجود کتے کے والد مرحوم کا بھونکنا سنایا۔ سن کر خود آبدیدہ ہوئے اور ہمیں بھی ان کی حالت دیکھ کر رونا آ گیا۔

کتا پالنے کی حسرت کا اظہار ہم نے بارہا مرزا کے سامنے کیا' مگر وہ کتے کا نام آتے ہی کاٹنے کو دوڑتے ہیں۔ کہتے ہیں "ہٹاؤ بھی! واہیات جانور ہے۔ بالکل بے مصرف۔ کتے کی تخلیق کا واحد مقصد یہ تھا کہ پطرس اس پر ایک لاجواب مضمون لکھے۔ سو یہ مقصد' عرصہ ہوا پورا ہو چکا اور اب اس نسل کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔" وہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ یہ نسل ناپید ہو بھی گئی تو اردو طنز نگاروں سے نام چلتا رہے گا۔ یوں تو سبھی جانوروں کے بارے میں مرزا کی معمولات ظالمانہ حد تک ادھوری ہیں (مثلاً ابھی کل شام تک وہ لومڑی کو گیدڑ کی مادہ سمجھے بیٹھے تھے اور غضب خدا کا' بڑے چیونٹے کو عام چیونٹی کا نر!) مگر کتوں کے ساتھ وہ خصوصیت سے تعصب برتتے ہیں اور اپنی بات کی پچ میں ایک سے ایک دلیل پیش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک دن

کہنے لگے۔
"جس گھر میں کتا ہو' اس گھر میں چور ہی نہیں' رحمت کے فرشتے بھی داخل نہیں ہو سکتے۔"
"چور کا داخل نہ ہونا تو سمجھ میں آتا ہے' مگر رحمت کے فرشتوں کو کیا ڈر ہے؟"

"اس لیے کہ کتا ناپاک ہوتا ہے۔"
"مگر کتے کو صاف ستھرا بھی رکھا جا سکتا ہے۔ انگریزوں کو دیکھئے' صبح و شام نہلاتے ہیں۔"
"اپلے کو اگر صبح و شام صابن سے دھویا جائے تو کیا پاک ہو جائے گا؟"
"مگر سوال یہ ہے کتا ناپاک کیسے ہوا؟"
"کج بحثی کوئی تم سے سیکھے۔ اللہ بخشے' نانی جان کہا کرتی تھیں کہ کتے کے منہ میں سور کی رال ہوتی ہے۔"
"لیجئے' آپ نے ناپاکی کی ایک اچھوتی توجیہ تلاش کر لی۔"
"بھائی میرے! ایک موٹی سے پہچان آج تمہیں بتائے دیتا ہوں۔ یاد رکھو' ہر وہ جانور جسے مسلمان کھا سکتے ہیں' پاک ہے۔"
"اس لحاظ سے مسلمان ممالک میں بکروں کو' اپنی پاکی و طہارت کے سبب' خاصا نقصان پہنچا ہے۔"
"بکنے والا بکا کریں۔ مسلمانوں نے کتے کو ہمیشہ کتا ہی کہا۔ بڑے آدمیوں کے نام سے نہیں پکارا۔"
"بڑے آدمیوں کی ایک ہی رہی۔ آپ نے سنا نہیں کہ نسلاً سب کتے ایک زمانے میں بھیڑیئے تھے؟ آدمی کی صحبت میں ان کا بھیڑیا پن جاتا رہا۔ مگر خود آدمی....."
"دیکھو' تم پھر لٹریچر بولنے لگے۔ علموں بس کریں او یارا!"
اس بارۂ خاص میں مرزا کے نسلی تعصب کی جڑیں ان کے سگ گزیدہ بچپن تک پہنچتی ہیں۔ اس لیے ہم نے خواہ مخواہ ان سے الجھنا مناسب نہ سمجھا اور چپ چاپ کتا رکھنے کی آرزو کو پالتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ دن آ گیا' جب ہمارا انگریز افسر بھاری دل

اور اس سے زیادہ بھاری قدموں کے ساتھ اپنے وطن کی جانب روانہ ہوا۔ اور روانگی سے قبل اس تعلق خاطر کی بنا پر، جو ہم کو اس سے اور اس کو اپنے کتے سے تھا، دریافت کیا۔

"تم چاہو، تو میرا کتا بطور یادگار رکھ سکتے ہو۔ امپورٹڈ السیشن ہے۔ تیرہ ماہ کا۔ سیزر کہہ کر پکارو تو دم ہلاتا آتا ہے۔" آپ اندازہ نہیں کر سکتے، اس صلائے خاص میں ایک کمزور دل کے آدمی کے لیے للچاہٹ کے کیا کیا سامان پوشیدہ تھے۔ اس میں مطلق شبہ نہ تھا کہ اس سے بہتر کوئی یادگار نہیں ہو سکتی کہ جب بھی وہ بھونکے گا، افسر کی یاد تازہ ہو جائے گی۔ پھر یہ کہ السیشن! کبھی ہم اس کو، کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں۔ افسر کی ادنیٰ مہربانی سے ہمیں اتنی خوشی ہوتی ہے کہ بقول مرزا، اگر اس وقت ہمارے دم ہوتی تو ایسی ہلتی کہ پھر نہ تھمتی۔

رہی سہی ہچکچاہٹ کو لفظ "امپورٹڈ" نے دور کر دیا۔ اس زمانے میں ہر وہ شے جو وطن عزیز میں پیدا نہ ہوئی ہو، قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی۔ چنانچہ ہر بگڑا ہوا مسلمان رئیس یہ ثابت کرنے پر تلا بیٹھا تھا کہ نہ صرف اس کے کتے کے، بلکہ اس کے اپنے بزرگ بھی اصلی امپورٹڈ تھے اور خالی ایک تلوار لے کر ماوراء النہر سے ہندوستان میں وارد ہوئے تھے۔ امپورٹڈ کتا سماج میں کیا حیثیت رکھتا ہے، اس کا سرسری سا اندازہ ان واقعات سے لگایا جا سکتا ہے جو دو سال پیشتر ہماری نظر سے گزر چکے تھے۔ ہم سے چار گھر دور مسٹر خلجی بیرسٹر رہتے تھے۔ ان کے والد مرحوم نے چند نایاب کتے ترکے میں چھوڑے تھے (چھوڑنے کو تو چند نایاب کتابیں بھی چھوڑیں تھیں مگر چونکہ وہ بھی کتوں ہی سے متعلق تھیں، اس لیے ہم نے قصداً ذکر نہیں کیا) انہی میں ایک دوغلی سی کتیا تھی۔ (جس کے متعلق ان کا فخریہ دعویٰ تھا کہ اس کی نانی جوزیفین کے تعلقات راسپوٹن سے رہ چکے تھے، جو ایک امپورٹڈ "گریٹ ڈین" کتا تھا۔ نیز یہ کہ وہ شملہ سول اینڈ ملٹری کنیل (Kennel) سے اس واردات کلبی کا سرٹیفکیٹ حاصل کر چکے ہیں،

جو ان کے سونے کے کمرے میں آج بھی آنکھوں کو نور' دل کو سرور بخشتا ہے) نام ماتا ہری رکھ چھوڑا تھا۔ کسی زمانے میں اس کے لجلجلے کان ہر وقت لٹکے رہتے تھے۔ مگر انہوں نے شہر کے بہترین سرجن سے آپریشن کرا کے السیشن کی طرح کھڑے کرا لیے تھے۔ رنگ ہلکا براؤن جیسے میٹھی آنچ پر سینکا ہوا توس۔ بیرسٹر صاحب کی اینگلو انڈین بیوی (جو خود بھی بڑی بھری پری عورت تھی اور سلطنت کی طرح دست بدست آئی تھی) اس پر اپنے ہاتھ سے یوڈی کلون چھڑک کر' مگر مچھ کی کھال کا جڑاؤ کالر پہنائے گھمانے لے جاتی اور اپنے جوتے سے میچ کرنے کے لیے اس پر ٹوتھ برش سے خضاب لگا دیتی۔ کبھی سیاہ' کبھی بولتا ہوا عنابی۔ یہ تو گرمیوں کی شاموں کے معمولات میں سے تھا۔ جاڑے میں ماتا ہری فرنچ برانڈی کے دو چمچے غٹا غٹ پی کر ایرانی قالین پر اپنی مالکہ کی طرح اطالوی ریشم کی انگیا کی تہمت لگائے سوتے جاگتے پہرا دیتی تھی۔ صورتاً بھیڑیا اور سیرتاً بھیڑ۔ ہم بھیڑ اس لیے کہہ رہے ہیں کہ صبح و شام ولایتی بسکٹ اور ڈبے کا گوشت کھاتے رہنے کے باوجود (یا شاید اسی وجہ سے) بقر عید کی رات کو محلے کے قصائی کے ساتھ بھاگ گئی اور تین شب بعد مٹکتی مٹکاتی لوٹی بھی تو اس طنطنے سے کہ ایک درجن رفقائے حیات جلو میں۔ چال جیسے قرہ العین حیدر کی کہانی۔ پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتی ہوئی۔ خوش صحبتی کے گلی گلی چرچے' مگر ذہانت چھو کر نہیں گئی تھی۔ بقول مرزا بالکل گدھی تھی۔ انہی سے مروی ہے کہ اکثر بازاری کتیوں کے پلے آ کر چسر چسر اس کے دودھ کا آخری قطرہ تک پی جاتے اور اپنے بچے دم ہلاتے یا پلاسٹک کی ہڈیاں چچوڑتے رہ جاتے۔ مگر ایمان کی بات یہ ہے کہ چوکیداری کے لیے چنداں بری نہ تھی کہ اپنی عزت و آبرو کے علاوہ ہر چیز کی بخوبی حفاظت کر سکتی تھی۔ اس کے یہ لچھن دیکھے تو بیرسٹر صاحب نے اس کی رکھوالی کے لیے ایک چوکیدار رکھا۔ اسی سال گرمیوں کی چھٹیوں میں وہ اپنے کنبے اور کتیا سمیت کار سے مری جانے لگے تو ان کے نانا جان قبلہ نے اچھا خاصا ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ بس اڑ گئے کہ میں اس "نجس کتی"

کے ساتھ کار میں سفر نہیں کر سکتا۔ لہٰذا بیرسٹر صاحب ان کو ہمارے ہاں چھوڑ گئے۔
جتنے دن بزرگوار موصوف ہمارے ہاں مہمان رہے بعد نماز عشاء ہاتھ پھیلا پھیلا کر منتقم حقیقی سے دعا مانگتے کہ پروردگار! مال زادی ماتا ہری سالانہ زچگی میں اپنے کیفر کردار کو پہنچے۔ کتیا کہیں کی! ہر رنگ' ہر سائز کی گالی ان کی روزمرہ گفتگو میں نگینے کی طرح جڑی ہوتی۔ دن بھر نماز کی چوکی پر بیٹھے سب کو حسب مراتب خورد و کلاں گالیاں دیتے رہتے۔ دعا میں بھی بے ساختہ یہی رنگ رہتا۔ مرزا کا خیال تھا کہ اگر وہ اپنے دل پر جبر کرکے دعا میں سے گالیاں حذف کر دیتے تو ساری تاثیر جاتی رہتی۔ جو دعا دل سے نہ نکلے کیونکر مستجاب ہو سکتی ہے؟ اوقات دعا کے علاوہ ہر آئے گئے کے سامنے اپنے نافرمان نواسے کے امتیازی سلوک کی شکایتوں کے دفتر کھول دیتے۔ ان کے تمام شکوک شکایتوں کا لب لباب بس یہ تھا کہ میرے ساتھ کتے جیسا سلوک کیوں نہیں کیا جاتا۔ آخر میں بھی جاندار ہوں۔
امپورٹڈ کتے کی چھیل چھبیلی نواسی کی یہ لذیذ حکایت بیان کرنے کا مدعا یہ ہے کہ لفظ "امپورٹڈ" نے انگریز افسر کے منہ سے نکلتے ہی ہماری مدافعت کی دیوار کو' جو کبھی بھی بہت بلند اور پختہ نہ تھی' یک لخت ڈھا دیا۔ بھلا ایسے صحبت یافتہ کتے روز روز کہاں ملتے ہیں۔ بالاخر شوق فضول ہمارے فطری خوف پر غالب آیا اور جہاز کا لنگر اٹھنے سے پہلے ہم نے اپنے آپ کو ایک خوش نصیب کتے کا مالک پایا۔
لیکن ایک بات کے لیے ہم بھی ذہنی بلکہ جسمانی طور پر تیار نہ تھے۔ "تیرہ ماہ" کی عمر سن کر ہمارے تصور میں ایک بہت ہی معمولی بھولی بھالی صورت ابھری تھی۔ ہم نے سوچا جیسے تیرہ مہینے کا آدمی کا بچہ بڑا پیارا سا ہوتا ہے۔ تھن متھنا' گبدا سا' غاؤں غاؤں کرتا ہوا۔ ویسا ہی یہ بھی ہوگا۔ سچ تو یہ ہے کہ بچہ کسی کا بھی ہو' بڑا "سویٹ" لگتا ہے۔ پھر یہ تو السیشن کا بچہ ٹھہرا۔ جی ہاں بچہ! دراصل ہم اس کے "امپورٹڈ" ہونے سے اس قدر مرعوب تھے کہ پلا کہتے ہوئے شرم سی محسوس ہوتی تھی۔
مگر سیزر ہر اعتبار سے ہماری توقعات سے بڑھ کر نکلا۔ اس کا سراپا کھینچ کر ہم ناظرین

کا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتے۔ اس کے ڈیل ڈول کا سرسری سا اندانہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہمارے دیرینہ کرم فرما پروفیسر قاضی عبدالقدوس کی سالم ران اس کے منہ میں آ جاتی تھی۔

اور یہ پروفیسر مذکور ہی نے بتایا کہ بندۂ خدا' تم نے بھی بڑا غضب کیا۔ تیرہ مہینے کا السیشن تو پورا پاٹھا کتا ہوتا ہے۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ تین مہینے سے زیادہ کا السیشن نہیں لینا چاہیے۔ اس پر مرزا نے یہ نمک چھڑکا کہ آنکھوں دیکھی بات ہے' کتے کی تندرستی اور نسل اگر مالک سے بہتر ہو تو وہ آنکھیں ملا کر ڈانٹ بھی نہیں سکتا۔ پھر یہ تو غیر معمولی طور پر خونخوار بھی نظر آتا ہے۔ ہم نے کہا' مرزا تم خواہ مخواہ ڈرتے ہو۔ بولے' جو شخص کتے سے بھی نہ ڈرے' مجھے اس کی ولدیت میں شبہ ہے۔ ہم نے کہا مرزا کتا اگر خونخوار نہ ہو تو پالنے سے فائدہ؟ پھر آدمی بکری کیوں نہ پال لے۔
بولے' ہاں بکری کتے سے بدرجہا بہتر ہے۔ بڑی بات یہ کہ جب چاہو' کاٹ کر کھا جاؤ۔

گرچہ چھوٹی ہے ذات بکری کی
دل کو بھاتی ہے بات بکری کی

بحثا بحثی میں ہم دونوں پٹڑی سے اتر گئے تھے۔ لٰہذا پروفیسر قاضی عبدالقدوس نے بحیثیت ثالث بالخیر بیچ میں پڑ کے اس معتدل رائے پر بحث ختم کی کہ کتے میں سے اگر جبڑا نکال دیا جائے تو خاصا معقول اور مخلص جانور ہے۔
قاضی عبدالقدوس نے کچھ غلط نہیں کہا تھا کہ بڑا کتا بڑی مشکل سے سدھایا جاتا ہے۔ پھر نیا گھر' نئے چہرے' نئی بو باس۔ نتیجہ یہ کہ پہلی رات خود سویا نہ دوسروں کو سونے دیا۔ رات بھر ایک سانس بھی منہ زبانی بھونکتا رہا۔ دوسری رات بھی وحشت کا یہی عالم رہا۔ البتہ چوبیس گھنٹے کی تربیت سے اتنا فرق ضرور پڑا کہ فجر کے وقت جن اراکین خاندان کی آنکھ لگ گئی تھی ان کے منہ چاٹ چاٹ کر خواب غفلت سے بیدار

کیا۔ تیسرے رتجگے سے پہلے ہم نے اسے ایک سونے کی گولی دی۔ کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ چوتھی رات دو دیں' مگر صاحب! کیا مجال' جو ذرا چپکا ہو جائے۔ زچ ہو کر مرزا سے رجوع کیا تو کہنے لگے' میری مانو' آج اسے کچھ نہ دو۔ خود تین گولیاں کھا لو۔ ہم نے ایسا ہی کیا۔ اس رات وہ بالکل نہیں بھونکا۔

لیکن حیرت اس بات پر ہوئی کہ صبح دس بجے ہمارے بہرے ہمسائے خواجہ شمس الدین (امپورٹڈ اینڈ ایکسپورٹر) نے ' جو نئے نئے پڑوس میں آئے تھے' ہمیں بڑی تدبیر سے جھنجھوڑ کر جگایا اور شکایت کی کہ رات بھی آپ کا کتا میرے گھر کی طرف منہ کرکے خوب بھونکا۔ اور (ہیرنگ ایڈ یعنی سننے کا آلہ اپنے کان میں فٹ کرتے ہوئے) اور دیکھ لیجئے' اس وقت بھی بہت جی لگا کے بھونک رہا ہے۔ ہم نے کہا' آپ کا ریڈیو بھی تو سارے سارے دن محلے کو سر پر اٹھائے رکھتا ہے۔ خدا گواہ ہے جس دن سے آپ پڑوس میں اٹھ کر آئے ہیں' ہم نے اپنے ریڈیو پروگرام سننا بند کر دیا ہے۔ پھر یہ کہ ہمارے پاس تو کتے کا لائسنس بھی ہے۔ لائسنس کا نام آتے ہی ان کے چہرے کا رنگ سیاہ سے بینگنی ہو گیا۔ جس کے نتیجے میں وہ اور ان کا ریڈیو تین ہفتے تک خاموش رہے۔ البتہ ان کے چوکیدار کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ راتوں کو اٹھ اٹھ کے اپنی ہیرنگ ایڈ کان سے لگا کر سنتے ہیں کہ ہمارا کتا بھونک رہا ہے یا سو گیا۔ ہمارے کانوں میں یہ بھنک بھی پڑی کہ اب وہ ہر ایک سے یہ کہتے پھر رہے ہیں کہ بعض نادہندہ اپنے قرض خواہوں سے بچنے کے لیے کتے پال لیتے ہیں۔ وہ کہتے بھی سنے گئے کہ سیزر اشرافوں کا کتا معلوم نہیں ہوتا۔ ادھر ان کی بیوی کی بدگمانی کا یہ حال تھا کہ سیزر جھوٹوں بھی دروازے میں سے جھانک لے تو جھٹ ہاتھ بر کا گھونگھٹ نکال لیتی تھیں۔

تین ہفتے بعد دیکھا کہ پھر منہ پھلائے کلبہ احزاں کی طرف چلے آ رہے ہیں۔ ہمارے پر جوش السلام علیکم کے جواب میں فرمایا' دیکھئے' اس سور کے بچے نے کیا کیا ہے۔ مرزا بیچ میں بول اٹھے۔ منہ سنبھال کر بات کیجئے۔ وہ کتے کا بچہ ہے۔ اس جملہ معترضہ کے بعد ہم بھی کچھ سخت بات کہنے والے تھے کہ مرزا نے جو اس وقت ہم سے "لوڈو"

کھیل رہے تھے' ہمارے کہنی مار کر اپنی چھجے دار بھنوؤں کی جنبش سے خواجہ شمس الدین کی بائیں ٹانگ کی طرف اشارہ کیا جو گھٹنے تک پائنچے سے بے نیاز تھی۔ ہم نے کن انکھیوں سے دیکھا تو زخم واقعی اتنا لمبا تھا کہ زپ لگا کر باآسانی بند کیا جا سکتا تھا۔
"ندامت اور انسانی ہمدردی کے جذبات سے مغلوب ہو کر ہم نے پوچھا۔ "کیا کتے نے کاٹا ہے؟"
"جی نہیں! میں نے خود ہی کاٹا ہے۔"
"ارے صاحب! گھوڑے بھی کچھ کم ظالم نہیں ہوتے۔" مرزا پھر بول اٹھے۔
مرزا کا یہ پرشماتت وار ایسا اچانک اور کاری تھا کہ وہیں ڈھیر ہو گئے۔ ایک دفعہ کو اپنے جسمانی زخم بھول گئے اور اندرونی چوٹوں کو سہلاتے اور گھوڑوں کی ماں بہنوں کو ارمان بھری گالیاں دیتے "فیڈ آؤٹ" ہو گئے۔ سے قصہ دراصل یہ تھا کہ ان کے بزرگ خیبر پار سے گھوڑے بیچنے ہندوستان آئے تھے اور مالا مال ہو کر یہیں پڑ رہے۔ آگے چل کر ان بزرگوں کی اولاد کو انہی گھوڑوں کی ناخلف اولاد نے تباہ کر ڈالا۔ وہ اس طرح کہ اس خانوادے کے آخری چشم و چراغ خواجہ شمس الدین کی "بلیک" کی کمائی کی ایک ایک پائی ریس میں انہی گھوڑوں کے بھینٹ چڑھتی اور ان کے اپنے اہل و عیال انکم ٹیکس والوں کی طرح' منہ دیکھتے رہ جاتے۔
اس نوع کی خوش طبعی سے قطع نظر سیزر ابتدائے سن بدتمیزی سے پرلے درجے کا کاہل واقع ہوا تھا اور دوڑ دوڑ کر کام کرنے کی بجائے دن کے بیشتر حصے میں دروازے پر محراب کی شکل میں چھائی ہوئی بوگن ولیا کے سائے میں لوٹیں لگاتا رہتا۔ درزی کی سوئی یوں تو ہر طرح کے کپڑے میں سے نکلتی ہے' مگر ایمان کی بات ہے' ہم نے سیزر کو کبھی کسی غلط آدمی کو کاٹتے نہیں دیکھا اور یہ کہنا تو سراسر غلط بیانی اور تہمت طرازی ہو گی کہ وہ بالکل جنگلی یا بے کہا تھا۔ سدھا سدھایا ضرور تھا۔ مگر صرف پچاس فیصد۔ اس اجمال پر ملال کی تفصیل یہ ہے کہ اگر بچے حکم دیتے کہ جاؤ' اس راہ گیر کے

پیچھے لگ جاؤ' تو یہ میرا شیر اپنی کمین گاہ سے نکل کر تعمیلاً جھپٹ پڑتا اور اس کی ٹائی پکڑ کے لٹک جاتا۔ لیکن جب دوسرا حکم ملتا کہ چھوڑ دو تو مجال ہے جو چھوڑ دے۔

مرزا کو مبدء فیاض نے حد درجہ محتاط اور وہمی طبیعت ودیعت کی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ انہیں آب حیات بھی پینا پڑے تو بغیر ابالے نہیں پئیں گے۔ اسی وضع احتیاط کے باعث انھوں نے سیزر کے آنے کے بعد ہمارے ہاں آنا جانا اتنا کم کر دیا کہ کبھی بھولے بھٹکے آ نکلتے تو ہم سب ان کی ایسی خاطر مدارت کرتے' ایسی گرمجوشی سے ملتے کہ انہیں خدشہ ہونے لگا کہ ہم قرض نہ مانگ بیٹھیں۔ ایک دن ہمارے ایماء پر پروفیسر عبدالقدوس مرزا کو طرح طرح سے سمجھانے لگے کہ کتا بڑا بے نظیر جانور ہے۔ کتے کے سوا کوئی جاندار پیٹ بھرنے کے بعد اپنے پالنے والے کا شکر ادا نہیں کرتا۔ غور کرو' دم دار جانوروں میں کتا ہی تنہا ایسا جانور ہے جو اپنی دم کو بطور آلہ اظہار خلوص و خوشنودی استعمال کرتا ہے۔ ورنہ باقی ماندہ گنوار جانور تو اپنی پونچھ سے صرف مکھیاں اڑاتے ہیں۔ دنبہ یہ بھی نہیں کر سکتا۔ اس کی دم صرف کھانے کے کام آتی ہے۔ البتہ بیل کی دم سے "ایکسی لیٹر" کا کام لیا جاتا ہے۔ مگر تمہیں بیل گاڑی تھوڑی دوڑانی ہے۔ (مرزا کے زانو پر ہاتھ مار کر) ہائے! ایک فرانسیسی ادیبہ کیا خوب کہہ گئی ہے کہ میں آدمیوں کو جتنے قریب سے دیکھتی ہوں' اتنے ہی کتے اچھے لگتے ہیں۔ (لہجہ بدل کر) کتوں سے ڈرنا بڑی نادانی اور بزدلی ہے' خصوصاً ولایتی کتوں سے! پھر مرزا کا ڈر نکالنے کے لیے انہی کے کھچڑی سر کی قسمیں کھا کھا کر یقین دلایا کہ انگریزوں کے کتے کے دانت مصنوعی ہوتے ہیں۔ کھانے کے اور' کاٹ کھانے کے اور۔ قسموں سے بھی بات بنتی نظر نہ آئی تو ہماری طرف اشارہ کرکے اپنا ذاتی تجربہ بیان کیا کہ ان کی دیکھا دیکھی میں نے بھی تین ہفتے سے اک دم کٹا "کاکر اسپینل" پلا پال رکھا ہے۔ (کاکر اسپینل کی مشہور پہچان معلوم ہے؟ اس کے کان اس کی ٹانگوں سے لمبے ہوتے ہیں اور ٹانگیں اتنی چھوٹی کہ زمین تک نہیں پہنچ پاتیں) دو ہفتے تو بچے دن دن بھر اسے گود میں لیے بھونکنا

سکھاتے رہے۔ مگر اب ان کو اس سے ذرا دور ہی رکھتا ہوں۔ کیونکہ جمعہ کو چھوٹے بچے نے کھیلتے کھیلتے اچانک اسے کاٹ کھایا۔ اپنے پہلے دانت سے۔ ابھی تک پلے کے پنسلین کے انجکشن لگ رہے ہیں۔

پروفیسر قاضی عبدالقدوس بے دودھ کی کافی کے گھونٹ لے لے کر یہ سگ بیتی سنا رہے تھے۔ بیٹھے بیٹھے سیزر کو نہ جانے کیا ہڑک اٹھی کہ بوگن ولیا کی اوٹ سے ان کے قیمہ بھرے سموسے پر جھپٹا۔ کافی منہ کی منہ میں رہ گئی۔ بد حواسی میں پیالی مرزا کے سر پر گری (جس سے موخر الذکر کئی جگہ سے چیخ گیا) اور پروفیسر مذکور گرم کافی کا غرارہ کرتے ہوئے اپنے قد سے اونچا پھاٹک پھلانگ گئے۔

مرزا نے پوچھا "کتے سے ڈر گئے؟"

"نہیں تو" وہ پھاٹک کے دوسری طرف سے بڑے برخوردار لہجے میں تھر تھر کانپتے ہوئے بولے۔

ممکن ہے یہ گفتگو کچھ دیر اور جاری رہتی' مگر موضوع گفتگو نے ایک ہی جست میں پروفیسر قاضی عبدالقدوس کو دبوچ لیا اور ان کی سڈول ران میں اپنے نوکیلے کیلے پیوست کر دیا۔ وہ منہ پھیر کر کھڑے ہو گئے۔ چار پانچ دن پہلے بھی ایسے ہی گتھم گتھا ہو چکی تھی کہ کبھی کتا ان کے اوپر اور کبھی۔ اور کبھی وہ کتے کے نیچے۔ لہٰذا ہم نے پھر وگن ولیا کی کانٹے دار ٹہنی توڑ کر ایک قمچی بنائی اور اس بدتمیز کو سڑاک سڑاک مارنے کو دوڑے۔ مگر پروفیسر موصوف جہاں کے تہاں ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ کہنے لگے' للہ یہ نہ کرو۔ ابھی تو میرے پچھلے نیل بھی نہیں مٹے۔

جیسا کہ ہمارے پڑھنے والوں نے بھانپ لیا ہو گا' کتا پالنا تو ایک طرف رہا کتوں اور پروفیسر قاضی عبدالقدوس کے باہمی تعلقات کاٹنے اور کٹوانے کے کامیاب تجربات سے کبھی آگے نہیں بڑھے۔ ورنہ ان کا علم الحیوانات اس حد تک کتابی یعنی ناقص ہے کہ ہمارے بچے جس دن بازار سے طوطے کا پہلا جوڑا خرید کر لائے تو ان سے دریافت کیا' چچا جان! ان میں نر کون سا ہے اور مادہ کون سی؟ فاضل پروفیسر نے چار پانچ منٹ تک

سوال اور جوڑے کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ پھر بہت محتاط انداز میں فرمایا۔ "بیٹا یہ بہت طوطا چشم جانور ہوتا ہے۔ ابھی دو تین مہینے اور دیکھو۔ دونوں میں سے جو پہلے انڈے دینا

شروع کر دے، وہی مادہ ہو گی۔" خیر، یہ لا علمی تو انسانی معذوری سمجھ کر پھر بھی معاف کی جا سکتی ہے کیونکہ طوطا اپنی مادہ کو انسان کی بہ نسبت زیادہ آسانی سے پہچان لیتا ہے، لیکن ایک دن ناصحانہ انداز میں بڑے تجربے کی بہت باریک بات یہ بتائی کہ یقین مانو، کتا رکھنے سے صحت بہتر ہو جاتی ہے۔ یہ سننا تھا کہ مرزا نے اتنے زور کا قہقہہ لگایا کہ تعلقات میں فوراً بال پڑ گیا جو کئی دفعہ کافی پلانے کے بعد دور ہوا۔
تعلقات جب از سر نو اس درجہ خوشگوار ہو گئے کہ ابے تبے سے گفتگو ہونے لگی تو مرزا کو تپانے کے لیے وہ پھر ثنائے سگ میں مشغول ہو گئے۔ ایک دن موج میں جو آئے تو بشارت دی کہ طبی نقطہ نگاہ سے کتا بہت مفید و مقوی جانور ہے۔ یہ سن کر مرزا انہیں مسلمان نظروں سے دیکھنے لگے تو وہ اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں پر اپنے ساتھ کے ان بیماروں کے نام گنوانے لگے، جنہیں اس نسل نے تندرستی کی دولت سے مالا مال کر دیا تھا اور دور کیوں جائیں۔ خود ان کو اپنے بالشت بھر کے پلے سے بے انتہا فائدہ پہنچ رہاتھا۔ مرزا نے کہا "ذرا کھول کے بات کرو۔" بولے "اب تم سے کیا پردہ، کتے کو روزانہ گوشت چاہیے اور یہ ہم پر کتا پالنے کے بعد ہی منکشف ہوا کہ پہلے ہمارے گھر میں روزانہ گوشت نہیں پکتا تھا اور ہم بڑی لا علمی میں زندگی بسر کر رہے تھے۔"
ان کی بناسپتی زندگی پر جو پردۂ غفلت چالیس سال سے پڑا ہوا تھا، اس کے دفعتہً اٹھنے بلکہ چاک ہونے کے بعد ہم اپنے آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ اب وہ اپنی صحت سے اس قدر مطمئن ہو گئے تھے کہ ایک نمبر بڑا جوتا پہننا شروع کر دیا تھا۔
ہم تو اس کو حسن اتفاق ہی کہیں گے کہ مدتوں بعد پروفیسر موصوف کی تندرستی ایک دم ایسی بحال ہوئی کہ ہمیں رشک آنے لگا۔ اس لیے کہ اب وہ اس قابل ہو گئے تھے کہ مہینے میں تین چار دن بغیر دوا کے رہ سکتے تھے۔ مرزا کہتے تھے کہ اس کی اصل

وجہ یہ ہے کہ انہیں اپنے خیالی پلے کو صبح و شام دو تین میل ٹہلانا پڑتا ہے۔
اونچی ذات کے کتوں کی صحت بخش صحبت سے پروفیسروں کی کایا پلٹ ہونا تو غیر شاعرانہ

خیال آرائی ہے۔ تاہم اس کی گواہی سارا محلّہ دے گا کہ ہمارے بعض احسان فراموش ہمسایوں کی گرتی ہوئی صحت پر سیزر کی موجودگی، خصوصاً اس کے بھونکنے کا نہایت خوشگوار اثر پڑا۔ جس کا ایک ادنیٰ کرشمہ یہ تھا کہ غریب کانے کے سامنے سے گزرتے ہوئے لدھڑ سے لدھڑ پڑوسی کی چال میں ایک عجیب چوکنا پن، ایک عجیب چستی اور لپک جھپک پیدا ہو جاتی تھی، سیزر منٹوں کا فاصلہ لمحوں میں طے کروا دیتا تھا۔ اوروں کا کیا ذکر، خود خواجہ شمس الدین (امپورٹر ایکسپورٹر) جو کہنے کو سیزر سے نالاں تھے، اس کے فیضان صحت سے اپنے کو نہ بچا سکے۔ سیٹھ صاحب موصوف کم و بیش پندرہ سال سے لو (Low) بلڈ پریشر کے لا علاج مریض تھے۔ علاج معالجے، ٹونے ٹوٹکوں پر لاکھوں روپے صرف کر چکے تھے۔ سب بے سود۔ اور اب یہ نوبت آ گئی تھی کہ لالچی ڈاکٹر بھی انہیں اپنا مستقل مریض بنانے کے لیے تیار نہ تھا۔ مبادا انہیں روز روز مطب میں بیٹھا دیکھ کر دوسرے مریض بدک جائیں کہ اس ڈاکٹر کے ہاتھ میں شفا نہیں۔ لیکن ہمارے پڑوس میں آنے کے تین مہینے کے اندر اندر نہ صرف یہ کہ ان کا "بلڈ پریشر" بڑھ کر نارمل ہو گیا بلکہ بفضلہ اس سے بھی پندرہ بیس درجے اوپر رہنے لگا۔

ان واقعات کا تعلق اس دور ناواقفیت سے ہے جب ہم کتا پالنا کھیل سمجھتے تھے۔ کینل کلب کا باقاعدہ ممبر بننے کے بعد ہمیں احساس ہوا کہ سیزر بچارا بالکل بے قصور تھا۔ غلطی سراسر ہماری ہی تھی کہ کتے کو مثل اپنی اولاد کے پال رہے تھے۔ یعنی ڈانٹ ڈانٹ کر۔ بڑے بڑے جگادریوں سے کتا پالنے کے ادب آداب سیکھے تو پتہ چلا کہ کتے کے ساتھ تو نرمی کا برتاؤ لازم ہے۔ بلکہ اس کے سامنے بچوں کو بے دردی سے پیٹنا نہیں چاہیے ورنہ اس کی شخصیت پچک کر رہ جاتی ہے۔ اور یہاں یہ کیفیت تھی کہ گھر کے ہر فرد نے اس پر بھونک بھونک کر اپنا گلا بٹھا لیا تھا۔ لیکن جیسے جیسے کتا بڑا ہوا،

ہم میں بھی سمجھ آتی گئی اور ڈانٹ پھٹکار کا سلسلہ بند ہو گیا۔
سیزر ہی کے دم خم سے آٹھ نو سال تک ایسی بے فکری رہی کہ کبھی تالا لگانے کی

ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ اس کو ہمارے مال و اسباب کی حفاظت کا اس درجہ خیال تھا
کہ شامت کا مارا کوئی کوا یا بلی باورچی خانے کے پاس سے بھی گزر جائے تو نتھنے پھلا
کر اس بری طرح کھدیڑتا کہ سارے چینی کے برتن ٹوٹ جاتے۔ گھر کی چوکیداری
اور کام کاج میں اس طرح ہاتھ بٹاتے کے علاوہ وہ ایک سمجھدار کتے کے دیگر فرائض
بھی انجام دیتا رہا جن سے صاف بوئے وفا آتی تھی۔ یہی نہیں کہ وہ ناشتے پر ہمارے
لیے تازہ اخبار منہ میں دبا کر لاتا' بلکہ جب مہینے کی پہلی تاریخ کو اخبار والا بل لے
کر آتا تو اس پر بھونکتا بھی تھا۔ اور ایک منہ میں اخبار لانے پر ہی موقوف نہیں۔ وہ
تو کہئے' ہم نے خود دو تین دفعہ سختی سے منع کر دیا ورنہ وہ تو ہمارے لیے توس بھی
اسی طرح لا سکتا تھا۔ کھانے پر دونوں وقت وہ ہماری کہنی سے لگا بیٹھا رہتا اور حسب
معمول ہم ہر پانچ لقموں کے بعد ایک لقمہ اسے بھی ڈال دیتے۔ اگر وہ اسے سونگھ کر
چھوڑ دیتا تو ہم بھی فوراً تاڑ جاتے کہ ہو نہ ہو کھانا باسی ہے۔
غرض کہ بہت ہی ذہین اور خدمتی تھا۔
وقت گزرتا دکھائی نہیں دیتا۔ مگر ہر چہرے پر ایک داستان لکھ جاتا ہے۔ کل کی سی
بات ہے۔ جب سیزر بچہ سا آیا تھا تو پروفیسر قاضی عبدالقدوس جو سدا سے یک رنگی کے
قائل ہیں' اتوار کے اتوار موچنے سے اپنے سر کے سفید بال اکھاڑا کرتے تھے' بال وہ
اب بھی اکھاڑتے تھے' مگر صرف کالے۔ (انہیں خود بھی اپنی عمر کا احساس ہو چلا تھا
اور غالباً اسی رعایت کے تحت اب صرف بال بچوں والی عورتوں پر ان کی طبیعت آتی
تھی) نادان بچوں کی وہ پہلی کھیپ جس نے سیزر کے ذریعے انگریزی سیکھی' اب ماشاء
اللہ اتنی سیانی ہو چکی تھی کہ اردو اشعار کا صحیح مطلب سمجھ کر شرمانے کے قابل ہو
گئی۔ سیزر بھی رفتہ رفتہ خاندان ہی کا ایک معمر رکن بن گیا۔ اس لحاظ سے کہ اب
کوئی اس کا نوٹس نہیں لیتا تھا۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے وہ بوڑھا ہو گیا اور ساتھ ہی ساتھ

دل میں اس کے لیے رفاقت و ہم سفری کا ایک احساس، درد مندی و ہم نصیبی کا ایک رشتہ پیدا ہو چلا کہ ہم نے ایک دوسرے کو بوڑھا ہوتے دیکھا تھا، ایک ساتھ وقت سے ہار مانی تھی۔

آج اس کی ایک ایک بات یاد آ رہی ہے۔ جوان تھا تو راہ چلتوں کا پنجے جھاڑ کر ایسا پیچھا کرتا کہ وہ گھگھیا کر قریب ترین گھر میں گھس جاتے اور بے آبرو ہو کر نکالے جاتے۔ وہ تاک میں رہتا اور نکلتے ہی ان کے منہ اور گردن کو ہر دفعہ بانداز دیگریوں بھنبھوڑتا گویا جانور نہیں، کسی انگریزی فلم کا ندیدہ ہیرو ہے (یہ مرزا کے الفاظ ہیں، کہتے ہیں انگریزی فلموں میں لوگ یوں پیار کرتے ہیں جیسے تخمی آم چوس رہے ہیں) ابھی تین سال پہلے تک اسے دیکھ کر پڑوسیوں کا چلوؤں خون سوکھتا تھا۔ مگر اب اتنا ضعیف ہو گیا تھا کہ دن بھر بوگن ولیا کے نیچے کسی مرشد کامل کی طرح مراقبے میں پڑا رہتا۔ بہت ہوا تو وہیں سے لیٹے لیٹے دم ہلا کر شفقت کا اظہار کر دیا۔ البتہ چھوٹے چھوٹے بچوں کو، خواہ گھر کے ہوں یا پاس پڑوس کے، اس نے کبھی مایوس نہیں کیا۔ اور ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کوئی بچہ اسے آواز دے کر گیند پھینکے اور وہ گودا بھری نلی چھوڑ چھاڑ، گیند اپنے منہ میں رکھ کر واپس نہ لائے۔ اس معاملے میں اسے بچوں کی تالیف قلوب اس درجہ عزیز تھی کہ کئی دفعہ فٹ بال تک منہ میں رکھ کر لانے کی کوشش کی۔

اعضاء و جوارح رفتہ رفتہ جواب دے رہے تھے۔ ساری تن پھن غائب، غرفش ختم۔ مرزا کے الفاظ میں اس کا بڑھاپا شباب پر تھا۔ کسی کسی دن سہ پہر تک بوگن ولیا کی چھاؤں میں وہی سنسنی خیز اردو اخبار اوڑھے اونگھتا رہتا، جس میں نوکر صبح قیمہ بندھوا کر لایا تھا۔ چاندنی اور ماداؤں کی مست مہک سے اب اس کے خون میں جوار بھاٹا نہیں آتا تھا۔ کہاں تو یہ عالم تھا کہ "گرمی" پر آتا تو سر شام ہی سے زنجیر تڑا کر قد آدم دیوار پھاند جاتا اور فجر کی اذان کے وقت شاد کام لوٹتا۔ یا اب اس جواں دیدہ بزرگ کا یہ حال

ہو گیا تھا کہ گرمائی ہوئی مادہ اور ہڈی بیک وقت نظر آ جائیں تو ہڈی پر ہی جھپٹتا تھا اور جب اس ہڈی کو پپولتے پپولتے اس کے بوڑھے جبڑے دکھنے لگتے تو اسے سرخ بوگن ولیا کے نیچے دفن کرکے وضو کے لوٹے میں منہ ڈال کر پانی پینے چلا جاتا۔ یقین نہیں آتا تھا کہ یہ وہی سیزر ہے جس کے جبڑے کی مہر محلے کے ہر تیسرے آدمی کی پنڈلی پر آج تک گواہی دے رہی ہے کہ

اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں آگے درد تھا

وہی دم جو ایک زمانے میں بقول شخصے سوالیہ نشان کی طرح کھڑی رہتی تھی، اب مفلس کی مونچھ کی مانند لٹکنے لگی۔ اس کے ہم عمر ایک ایک کرکے وہ گلیاں سونی کر گئے، جہاں سے راتوں کو ان دیکھے بھید بھرے جسموں کی خوشبوؤں کے بلاوے آتے تھے۔ وہ تنہا رہ گیا۔ بالکل تنہا و دل گرفتہ، نئی پود کے منہ زور کتوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا تو درکنار، وہ ان کے نودولتے مالکوں پر بھونکنا بھی اپنے رتبے کے منافی سمجھتا تھا۔ لیکن جس دن سے ماتا ہری کی جوان پھور بیٹی کلوپڑا بھری دوپہری میں ایک حلوائی کے بے نام کتے کے ساتھ بھاگی، وہ ہفتوں اپنے ہم جنس کی آواز تک کو ترسنے لگا۔ جب تنہائی سے بہت جی گھبرانے لگتا تو ریڈیو کے پاس آ کر بیٹھ جاتا اور پکے گانے سن کر بہت خوش ہوتا۔

جسم کے ساتھ ساتھ نظر بھی اتنی موٹی ہو گئی تھی کہ کبھی پروفیسر قاضی عبدالقدوس اجلے کپڑے پہن کر آ جاتے تو انہیں اجنبی سمجھ کر بھونکنے لگتا۔ البتہ سماعت میں فرق نہیں آیا تھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ انکل سے گیند کا پیچھا کرتا ہے اور اس کے ٹپا کھانے سے اس کی سمت اور محل

وقوع کا اندازہ کر لیتا ہے۔ ایک دن شام کو اچھا خاصا بوگن ولیا کے نیچے اپنا مخصوص آسن مارے (دائیں آنکھ' جو بچپن سے سرخ رہتی تھی' آدھی بند کئے بائیں پنجے پر تھوتھنی رکھے) بیٹھا تھا کہ ایک نیلی ربن والی بچی نے "شو" کہہ کر سڑک پر پنگ پانگ کی گیند پھینکی' وہ آواز کی سیدھ پر لپکا۔ مگر جیسے ہی گیند منہ میں پکڑ کے تیزی سے پلٹا' ایک کار کے بریک لگنے کی دلخراش آواز سنائی دی۔

بچے چیختے ہوئے دوڑے۔ سڑک پر دور تک ٹائروں کے گھسنے سے دو سیاہ پٹیاں بن گئیں۔ کار ایک دھچکے کے ساتھ رکی اور اپنے اسپرنگوں پر دو تین ہچکولے کھا کر غراتی ہوئی تیزی سی پہلے ہی موڑ پر مڑ گئی۔ مگر سیزر بیچ راستے ہی میں رہ گیا۔ اس کا پچھلا دھڑ کار کا پورا وزن سہار چکا تھا۔ منہ سے خون جاری تھا۔ اور پاس ہی گیند پڑی تھی جو اب سفید نہیں رہی تھی۔

سب نے مل کر اسے اٹھایا اور پھاٹک کے پاس بوگن ولیا کے نیچے لٹا دیا۔ لگتا تھا' شریانوں کے منہ کھل گئے ہیں۔ اور اس کی زندگی دل کی ہر دھڑکن کے ساتھ رس رہی ہے۔ ضرب بہ ضرب' قطرہ بہ قطرہ' دم بہ دم۔ ہر ایک اسے چھو چھو کر انگلیوں کی پوروں سے دل کی دھڑکن سن رہا تھا۔ وہ دھڑکن جو دوسری دھڑکن تک ایک نیا جنم' ایک نئی جون بخشتی ہے۔ کس جی سے کہوں کہ اس کا آب و دانہ اٹھ چکا تھا اور وہ رخصت ہو رہا تھا۔ اس ہمت' اس حوصلے' اس سکون کے ساتھ جو صرف جانوروں کا مقدر ہے۔ بغیر کراہے بغیر تڑپے بغیر ہراساں ہوئے۔ بس بے نور نظریں جمائے دیکھے چلا جا رہا تھا۔ باری باری سب نے اسے چمکارا۔ سر پر ہاتھ رکھتے ہی وہ آنکھیں جھکا لیتا تھا' اور یہ یاد کرکے سب کی آنکھیں بھر آئیں کہ اس کی زندگی میں آج پہلا موقع تھا کہ سر پر ہاتھ پھرواتے وقت وہ جواباً اپنی ریشم سی ملائم دم نہیں ہلا سکتا تھا۔ آج اس کے نتھنوں میں ایک اجنبی خون کی بو گھسی جا رہی تھی۔ کوئی آدھ گھنٹہ گزرا ہو گا کہ چار پانچ کوے اوپر منڈلانے لگے اور دھیرے دھیرے اتنے نیچے اتر آئے کہ ان کے

منحوس سائے اس پر پڑنے لگے۔ کچھ دیر بعد احاطے کی دیوار پر آ بیٹھے اور شور مچانے لگے۔ سیزر نے ایک نظر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ ایک لحظے کے لیے اس کے نتھنے پھڑک اٹھے۔ پھر اس نے اپنی آنکھیں جھکا لیں۔ ہم سے یہ نہ دیکھا گیا۔ اس کا خون آلود منہ کھول کر سونے کی گولیوں کی شیشی حلق میں الٹ دی اور کالر اتار دیا۔

ذرا دیر بعد وہ اپنے پیار کرنے والوں کی دھندلاتی صورتیں دیکھتا دیکھتا ہمیشہ کے لیے سو گیا۔

مارچ کے چڑھتے چاند کی بھیگی بھیگی روشنی میں جب بچوں نے مل کر اس کی محبوب بوگن ولیا کے نیچے زمین کی امانت زمین کو سونپنے کے لیے گہرا سا گڑھا کھودا تو چھوٹی بڑی بے شمار ہڈیاں نکلیں جنہیں وہ غالبًا دفن کرکے بھول گیا تھا۔ دور دور تک بوگن ولیا کی لمبی لمبی انگلیوں جیسی جڑیں اپنا راستہ ٹٹولتی ہوئی زمین کے نیم گرم سینے میں اترتی چلی گی تھیں اور اس کا رس چوس چوس کر شاخوں کے سروں پر دہکتے ہوئے پھولوں تک پہنچا رہی تھیں۔ مگر سوکھی پیاسی جڑوں کو آج سیزر کے لہو نے ان پھولوں سے بھی زیادہ سرخ کر دیا ہو گا جو بچوں نے لحد کا منہ اپنی سلیٹوں اور تختیوں سے بند کرکے اوپر بکھیر دیئے تھے۔ سے آخر میں نیلی ربن والی بچی سے نے اپنی سالگرہ کی موم بتیاں سرہانے روشن کر دیں۔ ان کی اداس روشنی میں بچوں کے میلے گالوں پر آنسوؤں کی نمکین اجلی لکیریں صاف چمک رہی تھیں۔

کئی مہینے بیت گئے' پت جھڑ کے بعد بوگن ولیا پھر انگارے کی طرح دہک رہی ہے مگر بچے آج بھی اس جگہ کسی آدمی کو پاؤں نہیں رکھنے دیتے کہ وہاں ہمارا ایک ساتھی سو رہا ہے۔

○ ◯ ○

- بارے آلو کا کچھ بیاں ہو جائے

دوسروں کو کیا نام رکھیں، ہم خود بیسیوں چیزوں سے چڑتے ہیں۔ کرم کلا، پنیر، کمبل، کافی اور کافکا، عورت کا گانا، مرد کا ناچ، گیندے کا پھول، اتوار کا ملاقاتی، مرغی کا گوشت، پاندان، غرارہ، خوبصورت عورت کا شوہر ...... زیادہ حد ادب کہ مکمل فہرست ہماری فرد گناہ سے بھی زیادہ طویل اور ہری بھری نکلے گی۔ گنہگار سہی، لیکن مرزا عبدالودود بیگ کی طرح یہ ہم سے آج تک نہ ہوا کہ اپنے تعصّبات پر معقولات کا نیم چڑھا کر دوسروں کو اپنی بے لطفی میں برابر کا شریک بنانے کی کوشش کی ہو۔ مرزا تو بقول کسے، غلط استدلال کے بادشاہ ہیں۔ ان کی حمایت و وکالت سے معقول سے معقول کاز نہایت لچر معلوم ہونے لگتا ہے۔ اسی لیے ہم سب انہیں تبلیغ دین اور حکومت کی حمایت سے بڑی سختی سے باز رکھتے ہیں۔ ان کی ایک چڑ ہوتو بتائیں۔ فہرست رنگا رنگ ہی نہیں، اتنی غریب پرور بھی ہے کہ اس میں اس فقیر بے تقصیر کا نام بھی خاصی اونچی پوزیشن پر شامل رہ چکا ہے۔ بعد میں ہم سے یہ پوزیشن بینگن کے بھرتے نے چھین لی اور اس سے جیکی کینیڈی کے دولہا اوناسس نے ہتھیا لی۔ مرزا کو آج جو چیز پسند ہے، کل وہ دل سے اتر جائے گی اور پرسوں تک یقیناً چڑ بن جائے گی۔ لوگ ہمیں مرزا کا ہمدم و ہمراز ہی نہیں، ہمزاد بھی کہتے ہیں۔ لیکن اس یگانگت و تقرب کے باوجود ہم وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ مرزا نے آلو اور ابوالکلام آزاد کو اول اول اپنی چڑ کیسے بنایا۔ نیز دونوں کو تہائی صدی سے ایک ہی بریکٹ میں کیوں بند کر رکھا ہے؟

- بوئے یاسمن باقیست

مولانا کے باب میں مرزا کو جتنا کھرچا، تعصب کے ملمع کے نیچے خالص منطق کی یہ موٹی موٹی تہیں نکلتی چلی گئیں۔ ایک دن کئی وار خالی جانے کے بعد ارشاد فرمایا۔ "ایک صاحب طرز انشاء پرداز نے نے بانی ندوہ العلماء کے بارے میں لکھا ہے کہ شبلی پہلا یونانی تھا جو مسلمانوں میں پیدا ہوا۔ اس پر مجھے یہ گرہ لگانے کی اجازت دیجئے کہ یونانیوں کی اس اسلامی شاخ میں ابوالکلام آخری اہل قلم تھے جس نے اردو رسم الخط میں عربی لکھی۔"

ہم نے کہا "ان کی شفاعت کے لئے یہی کافی ہے کہ انہوں نے مذہب میں فلسفے کا رس گھولا۔ اردو کو عربی کا سوز و آہنگ بخشا۔" فرمایا "ان کی نثر کا مطالعہ ایسا ہے جیسے دلدل میں تیرنا۔ اسی لیے مولوی عبدالحق اعلانیہ انہیں اردو کا دشمن کہتے تھے۔ علم و دانش اپنی جگہ، مگر اس کو کیا کیجئے کہ وہ اپنی انا اور اردو پر آخری دم تک قابو نہ پا سکے۔ کبھی کبھار رمضان میں ان کا ترجمان القرآن پڑھتا ہوں تو (اپنے دونوں گالوں پر تھپڑ مارتے ہوئے) نعوذ باللہ محسوس ہوتا ہے۔ گویا کلام اللہ کے پردے میں ابوالکلام بول رہا ہے۔" ہم نے کہا "لاحول ولا قوہ! اس بزرگ کی تمام کردہ و ناکردہ خطائیں تمہیں صرف اس بنا پر معاف کر دینی چاہئیں کہ تمہاری طرح وہ بھی چائے کے رسیا تھے۔ کیا نام تھا ان کی پسندیدہ چائے کا؟ اچھا سا نام تھا۔ ہاں یاد آیا۔ وہائٹ جیسمین! یاسمن سفید"

شگفتہ ہوئے، فرمایا "مولانا کا مشروب بھی ان کے مشرب کی مانند تھا۔ ٹوٹے ہوئے بتوں کو جوڑ جوڑ کر امام الہند نے ایسا معبود تراشنے کی کوشش کی، جو اہل سومنات کو بھی قابل قبول ہو۔ یونانی فلسفے کی عینک سے جب انہیں دین میں دنیا اور خدا میں ناخدا کا جلوہ نظر آنے لگا تو وہ مسلمان ہو گئے اور سچے دل سے اپنے آپ پر ایمان لے آئے۔ اسی طرح یہ چینی چائے محض اس لیے ان کے دل کو بھا گئی کہ اس میں چائے کے بجائے چنبیلی کے گجرے کی لپٹ آتی ہے۔ حالانکہ کوئی شخص جو چائے پینے کا ذرا بھی سلیقہ رکھتا ہے، اس لیے چائے پیتا ہے کہ اس میں چائے کی، فقط چائے کی مہک آتی ہے، نہ کہ چنبیلی کے تیل کا بھبکا۔"

ہم نے کہا "تعجب ہے! تم اس بازاری زبان میں اس آب نشاط انگیز کا مضحکہ اڑا رہے ہو، جو بقول مولانا طبع شورش پسند کو سرمستیوں کی اور فکر عالم آشوب کو آسودگیوں کی دعوت دیا کرتی تھی۔" اس جملے سے ایسے بھڑکے کے بھڑکتے چلے گئے۔ لال پیلے ہو کر بولے "تم نے لپٹن کمپنی کا قدیم اشتہار، چائے سردیوں میں گرمی اور گرمیوں میں ٹھنڈک پہنچاتی ہے، دیکھا ہو گا۔ مولانا نے یہاں اسی جملے کا ترجمہ اپنے مداحوں کی آسانی کے لیے اپنی زبان میں کیا ہے۔" بحث اور دل شکنی کا یہ سلسلہ کافی دیر تک جاری رہا۔ لیکن مزید نقل کفر کرکے ہم اپنی دنیا و عاقبت خراب کرنا نہیں چاہتے۔ لہٰذا اس تشبیب کے بعد مرزا کی دوسری چڑ یعنی آلو کی طرف گریز کرتے ہیں۔

○ یہ دانت سلامت ہیں جب تک

مرزا کا "باس" دس سال بعد پہلی مرتبہ تین دن کی رخصت پر جا رہا تھا۔ اور مرزا نے اپنے مشیروں اور بہی خواہوں کو جشن نجات منانے کے لیے پچ لگژری ہوٹل میں لنچ پر مدعو کیا تھا۔ وہاں ہم نے دیکھا کہ سمندری کچھوے کا شوربہ سڑ سڑ پینے کے بعد مرزا مسلم کیکڑے (مسلم کے معنی یہ ہیں کہ مرحوم کی سالم ٹانگیں، کھپرے، آنکھیں اور مونچھیں پلیٹ پر رکھ کر اپنی قدرتی حالت میں نظر آ رہی تھیں) پر ٹوٹ پڑے۔ ہم نے کہا "مرزا ہم نے تمہیں چکا مارتی خمیری نان کھاتے دیکھا ہے، کھروں کے چپچپے سریش میں ڈبو ڈبو کر، جسے تم دلی کے نہاری پائے کہتے ہو۔ مفت کی مل جائے تو سڑاندی سارڈین یوں نگلتے ہو گویا ناک نہیں رکھتے اور تو اور رنگا ماٹی میں چکما قبیلے کی ایک دوشیزہ کے ہاتھ سے نشیلا کسیلا جیک فروٹ لپ لپ کھاتے ہوئے فوٹو کھنچوا چکے ہو۔ اور اس کے بعد پشاور میں چڑوں کے پکوڑے کھاتے ہوئے بھی پکڑے جا چکے ہو۔ تمہارے مشرب اکل و شرب میں ہر شے حلال ہے، سوائے آلو کے۔"

کھل گئے۔ فرمایا "ہم نے آج تک کسی مولوی، کسی فرقے کے مولوی کی تندرستی خراب نہیں دیکھی۔ نہ کسی مولوی کا ہارٹ فیل ہوتے سنا۔ جانتے ہو کیا کیا وجہ ہے؟ پہلی

وجہ تو یہ کہ مولوی کبھی ورزش نہیں کرتے۔ دوسری یہ کہ سادہ غذا اور سبزی سے پرہیز کرتے ہیں۔"

○ ہوٹل ہذا اور آلو کی عملداری

سبزی نہ کھانے کے فوائد ذہن نشین کرانے کی غرض سے مرزا نے اپنی زیرِ تجربہ زندگی کے ان گوشوں کو بے نقاب کیا جو آلو سے کیمیائی طور پر متاثر ہوئے تھے۔ ذکر آلو کا ہے۔ انہی کی زبان غیبت بیان سے اچھا معلوم ہو گا۔
تمہیں تو کیا یاد ہو گا۔ میں دسمبر ۱۹۵۱ء میں منٹگمری گیا تھا۔ پہلی دفعہ کراچی سے باہر جانے کی مجبوری لاحق ہوئی تھی۔ منٹگمری کے پلیٹ فارم پر اترتے ہی محسوس ہوا گویا سردی سے خون رگوں میں جم گیا ہے۔ ادھر چائے کے اسٹال کے پاس ایک بڑے میاں گرم چائے کے بجائے مالٹے کا رس پیئے چلے جا رہے تھے۔ اس بندۂ خدا کو دیکھ دیکھ کر اور دانت بجنے لگے۔ کراچی کا دائمی حبس اور بغیر کھڑکیوں والا کمرہ بے طرح یاد آئے۔ قلی اور تانگے والے سے صلاح و مشورہ کے بعد ایک ہوٹل میں بسترا لگا دیا، جس کا اصلی نام آج تک معلوم نہ ہو سکا۔ لیکن مینجر سے لے کر مہتر تک سبھی اسے ہوٹل ہذا کہتے تھے۔ کمرہ صرف ایک ہی تھا جس کے دروازے پر کوئلے سے بحروف انگریزی وارد کمرہ نمبرا لکھا تھا۔ ہوٹل ہذا میں نہ صرف یہ کہ کوئی دوسرا کمرہ نہ تھا، بلکہ مستقبل قریب یا بعید میں اس کی تعمیر کا امکان بھی نظر نہیں آتا تھا۔ کیونکہ ہوٹل کے تین طرف میونسپلٹی کی سڑک تھی اور چوتھی طرف اسی دروازے کی مرکزی نالی جو شہر کی گندگی کو شہر ہی میں رکھتی تھی، البتہ ایک اٹیچڈ تنور تھا، جس سے کمرہ اس کڑاکے کی سردی میں ایسا گرم رہتا تھا کہ بڑے بڑے "سنٹرلی ہیٹڈ" (Centrally Heated-

ہوٹلوں کو مات کرتا تھا۔ پہلی رات ہم بنیان پہنے سو رہے تھے کہ تین بجے صبح جو تپش سے ایکا ایکی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ امام دین بیرا ہمارے سامنے ہاتھ بھر لمبی خون آلود چھری لیے کھڑا ہے۔ ہم نے فوراً اپنی گردن پر ہاتھ پھیر کر دیکھا۔ پھر چپکے سے بنیان میں ہاتھ ڈال کر پیٹ پر چٹکی لی اور پھر کلمہ پڑھ کر اتنی زور سے چیخ ماری کہ امام دین اچھل پڑا اور چھری چھوڑ کر بھاگ گیا۔ تھوڑی دیر بعد دو تین بیرے سمجھا بجھا کر اسے واپس لوا لائے۔ اس کے اوسان بحال ہوئے تو معلوم ہوا کہ چھری سے وہ ننھی ننھی بٹیریں ذبح کر رہا تھا۔ ہم نے ایک وقار کے ساتھ کہا۔ "عقلمند آدمی' یہ پہلے کیوں نہ بتایا؟" اس نے فوراً اپنی بھول کی معافی مانگی اور وعدہ کیا کہ آئندہ وہ پہلے ہی بتا دیا کرے گا کہ چھری سے بٹیر ہی ذبح کرنا چاہتا ہے۔ نیز اس نے آسان پنجابی میں یہ بھی یقین دلایا کہ آئندہ وہ چیخ سن کر ڈرپوکوں کی طرح خوفزدہ نہیں ہوا کرے گا۔

ہم نے رسان سے پوچھا "تم انہیں کیوں ذبح کر رہے تھے؟" بولا "جناب ضلع منٹگمری میں جانور کو حلال کرکے کھایا جاتا ہے۔ آپ بھی کھائیں گے؟" ہم نے قدرے ترشوائی سے جواب دیا "نہیں" اور ریلوے ٹائم ٹیبل سے پنکھا جھلتے ہوئے سوچنے لگے کہ جو لوگ دودھ پیتے بچوں کی طرح جلدی سوتے اور جلدی اٹھتے ہیں' وہ اس رمز کو کیا جانیں کہ نیند کا اصل مزا اور سونے کا صحیح لطف آتا ہی اس وقت ہے جب آدمی اٹھنے کے مقررہ وقت پر سوتا رہے کہ اسی ساعت دزدیدہ میں نیند کی لذتوں کا نزول ہوتا ہے۔ اسی لیے کسی جانور کو صبح دیر تک سونے کی صلاحیت نہیں بخشی گئی۔ اپنے اشرف المخلوقات ہونے پر خود کو مبارکباد دیتے دیتے صبح ہو گئی اور ہم پوری اور آلو چھولے کا ناشتہ کرکے اپنے کام پر چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد معدے میں گرانی محسوس ہوئی۔ لہٰذا دوپہر کو آلو پلاؤ اور رات کو آلو اور پنیر کا قورمہ کھا کر تنور کی گرمائی میں ایسے سوئے کہ صبح چار بجے بیرے نے اپنے مخصوص طریقے سے ہمیں جگایا' جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

ناشتے سے پہلے ہم سر جھکائے قمیض کا بٹن نوچ کر پتلون میں ٹانکنے کی کوشش کر رہے

تھے کہ سوئی کھچ سے انگلی میں بھک گئی۔ بالکل اضطراری طور پر ہم نے انگلی اپنی قمیض کی جیب پر رکھ کر زور سے دبائی' مگر جیسے ہی دوسری غلطی کا احساس ہوا تو خون کے گیلے دھبے پر سفید پاؤڈر چھڑک کر پسانے لگے اور دل میں سوچنے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے بیوی بھی کیا چیز بنائی ہے لیکن انسان بڑا ہی ناشکرا ہے۔ اپنی بیوی کی قدر نہیں کرتا۔ اتنے میں بیرا مقامی خالص گھی میں تلی ہوئی پوریاں لے آیا۔ منٹگمری کا اصلی گھی پاکستان بھر میں سب سے اچھا ہوتا ہے۔ اس میں چار فیصد گھی ہوتا ہے۔ بیرے نے حسب معمول اپنے ابروئے تساہل سے ہمیں کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور جب ہم اس پر ۴ کے ہندسے کی طرح تہرے ہو کر بیٹھ گئے تو ہمارے زانو پر گیلا تولیہ بچھایا اور اس پر ناشتے کی ٹرے جما کر رکھ دی۔

(ممکن ہے بعض شکی مزاج قارئین کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ اگر کمرے میں میز یا اسٹول نہیں تھا تو بان کی چارپائی پر ناشتہ کیوں نہ کر لیا۔ شکایتاً نہیں اطلاعاً عرض ہے کہ جیسے ہی منٹگمری کا پہلا مرغ پہلی بانگ دیتا' بیرا ہماری پیٹھ اور چارپائی کے درمیان سے بستر ایک ہی جھٹکے میں گھسیٹ لیتا۔ اپنے زور بازو اور روزمرہ کی مشق سے اس کام میں اتنی صفائی اور مہارت پیدا کر لی تھی کہ ایک دفعہ سرہانے کھڑے ہو کر جو بستر گھسیٹا تو ہمارا بنیان تک اتر کر بستر کے ساتھ لپٹ کر چلا گیا اور ہم کھری چارپائی پر کیلے کی طرح چھلے ہوئے پڑے رہ گئے۔ پھر چارپائی کو پائنتی سے اٹھا کر ہمیں سر کے بل پھسلاتے ہوئے کہنے لگا' "صاب! فرنیچر خالی کرو۔" وجہ یہ اس فرنیچر پر سارے دن "پروپرائٹر اینڈ مینجر ہوٹل ہذا" کا دربار لگا رہتا تھا۔ ایک دن ہم نے اس بے آرامی پر پرزور احتجاج کیا تو ہوٹل کے قواعد و ضوابط کا پنسل کا لکھا ہوا ایک نسخہ ہمیں دیا گیا جس کے سرورق پر "ضابطہ فوجداری ہوٹل ہذا" تحریر تھا۔ اس کی

دفعہ ۹ کی رو سے فجر کی اذان کے بعد "پسنجر" کی چارپائی پر سونے کا حق نہیں تھا۔ البتہ قریب المرگ مریض' زچہ اور یہود و نصاریٰ اس سے مستثنیٰ تھے۔ لیکن آگے چل کر دفعہ ۲۸(ب) نے ان سے بھی یہ مراعات چھین لی تھیں۔ اس کی رو سے زچہ اور قریب المرگ مریض کو زچگی اور موت سے تین دن پہلے ہوٹل میں آنے کی اجازت نہیں تھی۔ خلاف ورزی کرنے والوں کو بیروں کے حوالے کر دیا جائے گا۔"

ہم نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو اسے جھاڑن منہ میں ٹھونسے بڑے ادب سے ہنستے ہوئے پایا۔ ہم نے پوچھا "ہنس کیوں رہے ہو؟" کہنے لگا "وہ تو مینجر صاحب ہنس رہے تھے۔ بولتے تھے' ہم کو لگتا ہے کراچی کا پسنجر بٹیر کو تلیر سمجھ کے نہیں کھاتا۔"

ہر چیز کے دو پہلو ہوا کرتے ہیں۔ دوسرا زیادہ تاریک۔ لیکن ایمان کی بات ہے اس پہلو پر ہماری نظر بھی نہیں گئی تھی۔ اور اب اس غلط فہمی کا ازالہ ہم پر واجب ہو گیا تھا۔ پھولی ہوئی پوری کا لقمہ پیٹ میں واپس رکھتے ہوئے ہم نے رندھی ہوئی آواز میں اس جعل ساز پرند کی قیمت دریافت کی۔ بولا "زندہ یا مردہ؟" ہم نے جواب دیا کہ ہم تو اس شہر میں اجنبی ہیں۔ فی الحال مردہ کو ہی ترجیح دیں گے۔ کہنے لگا "دس آنے کی پلیٹ ملتی ہے۔ ایک پلیٹ میں تین بٹیریں ہوتی ہیں۔ مگر جناب کے لیے تو ایک ہی راس کافی ہو گی۔"

قیمت سن کر ہمارے منہ میں پانی بھر آیا۔ پھر یہ بھی تھا کہ کراچی میں مویشیوں کا گوشت کھاتے کھاتے طبیعت اکتا گئی تھی۔ لہٰذا دل ہی دل میں عہد کر لیا کہ جب تک منٹگمری کا آب و دانہ ہے' طیور کے سوا کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگائیں گے۔ لنچ پر بھنی ہوئی بٹیر' چائے کے ساتھ بٹیر کا تنوری چرغہ' سونے سے پہلے بٹیر کا آب جوش۔ اس رہائشی تنور میں فروکش ہوئے ہمیں چوتھا دن تھا' اور تین دن سے یہی اللے تللے تھے۔ چوتھی صبح ہم زانو پہ تولیہ اور تولیے پر ٹرے رکھے تلی ہوئی بٹیر سے ناشتہ کر رہے تھے کہ بیرے نے جھاڑن پھر منہ میں ٹھونس لی۔ ہم نے چمک کر پوچھا "اب کیا بات ہے؟" کہنے

لگا "کچھ نہیں' مینجر صاحب ہنس رہے تھے۔ بولتے تھے کمرہ نمبرا کے ہاتھ بٹیر لگ گئی ہے۔" ہم نے طنزاً اٹیچڈ تنور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا "تمہارے ہوٹل ہذا میں اور کون سا من و سلویٰ اترتا ہے؟" بولا "حرام گوشت کے سوا دنیا بھر کی ڈش ملتی ہے جو چاہیں آرڈر کریں' جناب۔" آلو مٹر' آلو گوبھی' آلو میتھی' آلو گوش' آلو مچھی' آلو بریانی' اور خدا تمہارا بھلا کرے' آلو کوفتہ' آلو بڑیاں' آلو سموسہ' آلو کا رائتہ' آلو کا بھرتا' آلو کیماں" ...... ہم نے روک کر پوچھا "اور سویٹ ڈش؟" بولا "آلو کی کھیر" ہم نے کہا "بھلے آدمی! تم نے تو آلو کا پہاڑہ سنا دیا۔ تمہارے ہوٹل میں کوئی ایسی ڈش بھی ہے جس میں آلو کا نام نہ آئے۔ فاتحانہ تبسم کے ساتھ فرمایا "کیوں نہیں' پوٹیٹو کٹلٹ! حاضر کروں جناب؟"

قصہ در اصل یہ تھا کہ ایک سال پہلے مالک ہوٹل ہذا نے ہیڈ کانسٹیبل کے عہدے سے سبکدوش ہو کر زراعت کی طرف توجہ فرمائی۔ اور زمین سے بھی انہی ہتھکنڈوں سے سونا اگلوانا چاہا۔ مگر ہوا یہ کہ آلو کی کاشت میں پچیّس سال کی ذہانت سے جمع کی ہوئی رشوت ہی نہیں' بلکہ پنشن اور پراویڈنٹ فنڈ بھی ڈوب گئے۔ "زمین کھا گئی بے ایماں کیسے کیسے"

پس انداز کئے ہوئے آلوؤں سے ہوٹل کے دھندے کا ڈول ڈالا جنہیں اب اس کے بہترین دوست بھی تازہ نہیں کہہ سکتے تھے۔ سنا ہے بٹیر بھی اسی زمانے میں پاس پڑوس کے کھیتوں سے پکڑ لیے تھے۔

○ مکالمہ در مذمت آلو

"مرزا' یہ بٹیر نامہ اپنی جگہ' مگر یہ سوال ابھی تشنہ ہے کہ تم آلو کیوں نہیں کھاتے۔" ہم نے پھر وہی سوال کیا۔

"نہیں صاحب! آلو کھانے سے آدمی آلو جیسا ہو جاتا ہے۔ کوئی انگریز عورت جسے اپنا

"فگر" اور مستقبل ذرا بھی عزیز ہے' آلو کو چھوتی تک نہیں۔ سامنے سوئمنگ پول میں پیر لٹکائے' یہ میم جو مصر کا بازار کھولے بیٹھی ہے' اسے تم آلو کی ایک ہوائی بھی کھلا دو تو بندہ اسی حوض میں ڈوب مرنے کو تیار ہے۔ اگر یہ کافی میں چینی کے چار دانے بھی ڈالتی ہے' یا کوئی اسے میٹھی نظر سے بھی دیکھ لے' تو اس کی کیلوریز کا حساب اپنی دھوبی کی کاپی میں رکھتی ہے۔" انھوں نے جواب دیا۔

"مرزا! کیا میمیں بھی دھوبی کی کاپی رکھتی ہیں؟"

"ہاں! ان میں کی جو کپڑے پہنتی ہیں' وہ رکھتی ہیں۔"

ہماری تشنگی علم بڑھتی دیکھ کر مرزا آلو کی ہجو میں دلائل و نظائر کی طومار باندھ دیا۔ جہاں کہیں منطق کے ٹاٹ میں ذرا سا سوراخ بھی نظر آیا' وہاں مخملی مثال کا بڑا سا پیوند اسی طرح لگایا کہ جی چاہتا تھا کچھ اور سوراخ ہوتے۔ کہنے لگے کرنل شیخ کل ہی یورپ سے لوٹے ہیں۔ کہہ رہے تھے یورپ کی اور ہماری خواتین میں بڑا فرق ہے۔ یورپ میں جو لڑکی دور سے سترہ برس کی معلوم ہوتی ہے وہ قریب پہنچ کر ستر برس کی نکلتی ہے اور ہمارے ہاں جو خاتون دور سے ستر برس کی دکھلائی پڑتی ہے وہ نزدیک آنے پر سترہ برس کی نکلتی ہے۔ مگر یہ وضع داری انگلستان میں ہی دیکھی کہ جو عمر دوسر سے نظر آتی ہے وہی پاس سے۔ چنانچہ کمر کمر تک بالوں والی جو لڑکی دور سے انیس سال کی نظر آتی ہے وہ پاس جانے پر بھی انیس ہی سال کا "ہپی" نکلتا ہے۔ خیر سنی سنائی باتوں کو چھوڑو۔ اس میم کا مقابلہ اپنے ہاں کی آلو خور خواتین سے کرو۔ ادھر فانوس کے نیچے سرخ ساری میں جو محترمہ لیٹر بکس بنی اکیلے اکیلے گپا گپ بیف اسٹیک اور آلو اڑا رہی ہیں۔ اماں! گنواروں کی طرح انگلی سے اشارہ مت کرو۔ ہاں ہاں! وہی۔ ارے صاحب کیا چیز تھی' لگتا تھا ایک اپسرا سیدھی اجنتا کے غاروں سے چلی آ رہی ہے۔ اور کیا فگر تھا۔ کہتے ہوئے زبان سو سو بل کھاتی ہے۔

"چلتی تو یوں قدم رکھتی تھی دن جیسے کسی کے پھرتے ہیں"

پہلے پہل مارچ ۱۹۵۱ء میں دیکھا تھا۔ وہ صبح یاد آتی ہے تو کوئی دل پر دستک سی دینے لگتا ہے۔ اور اب؟ تمہاری آنکھوں کے سامنے ہے۔ بارہ سال پہلے کی Go-Go-Girl گوشت کے انبار میں کہیں کھو گئی ہے۔ عشق اور آلو نے ان حالوں کو پہنچا دیا۔

ہم نے کہا "ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ" بولے "اہل زبان کے محاورے انہی کے خلاف اندھا دھند استعمال کرنے سے پہلے پوری بات تو سن لیا کرو۔ حمیرہ وہ آئیڈیل عورت تھی، جس کے خواب ہر صحت مند آدمی دیکھتا ہے۔ یعنی شریف خاندان، خوبصورت اور آوارہ! اردو، انگریزی، فرنچ اور جرمن فراٹے سے بولتی تھی، مگر کسی بھی زبان میں "نہ" کہنے کی قدرت نہیں رکھتی تھی۔ حسن اور جوانی کی بشرکت غیرے مالک تھی۔ یہ دونوں اشیائے لطیف جب تبرک ہو گئیں اور پلکوں کے سائے گہرے ہو چلے تو مارے باندھے ایک عقد شرعی بھی گیا۔ مگر ایک مہینے کے اندر ہی دولہا نے عروسی کمر بند کا پھندا گلے میں ڈال کر خودکشی کر لی۔ جا تجھے کشمکش عقد سے آزاد کیا۔ پھر تو ایسے کان ہوئے کہ اس بچاری نے شرعی تکلفات سے خود کو کبھی مکلف نہیں کیا۔ صاحب! مرد کا کیا ہے آج کل مرد زندگی سے اکتا جاتا ہے تو شادی کر لیتا ہے۔ اور اگر شادی شدہ ہے تو طلاق دے دیتا ہے۔ لیکن عورت ذات کی بات اور ہے۔ بدی پہ آئی ہوئی عورت جب پریشان یا پشیمان ہوتی ہے تو ٹی ایس ایلیٹ کے بقول گراموفون ریکارڈ لگا کر اپنے جوڑے کو میکانکی انداز سے تھپتھپاتے ہوئے خوابگاہ میں بولائی بولائی نہیں پھرتی، بلکہ غذا سے غم غلط کرتی ہے حمیرہ نے بھی مرد کی بیوفائی کا مقابلہ اپنے معدے سے کیا۔ تم خود دیکھ لو۔ کس رفتار سے آلو کے قتلے قاب سے پلیٹ اور پلیٹ سے پیٹ میں منتقل کر رہی ہے۔ بس اسی نے صورت سے بے صورت کر دیا۔

ہم نے ان کا وقت اور اپنی رہی سہی عزت بچانے کی خاطر ان کی اس "تھیوری" سے جھٹ اتفاق کر لیا کہ زنانہ آوارگی کی روک تھام کے لیے عقد اور آلو سے بہتر کوئی آلہ نہیں کہ دونوں سے بدصورتی اور بدصورتی سے نیک چلنی زور پکڑتی ہے۔ ان کی ہاں

میں ہاں ملاتے ہوئے ہم نے کہا "لیکن اگر آلو سے واقعی موٹاپا پیدا ہوتا ہے تو تمہارے حق میں تو الٹا مفید ہو گا۔ کیونکہ اگر تمہارا وزن صحیح مان لیا جائے تو معیاری حساب سے تمہارا قد تین فٹ ہونا چاہیے۔ ایک دن تمہی نے بتایا تھا کہ آستین کے لحاظ سے ۱۷ نمبر کی قمیض تمہیں فٹ آتی ہے اور کالر کے لحاظ سے ۱۳ نمبر۔"

○ کرشمے کاربوہائیڈریٹ کے

اسی سال جون میں مرزا اپنے دفتر میں اگاتا کرسٹی کا تازہ ناول پڑھتے ہوئے اچانک بے ہوش ہو گئے۔ ہوش آیا تو خود کو ایک آرام دہ کلینک میں کمپنی کے خرچ پر صاحب فراش پایا۔ انہیں اس بات سے سخت مایوسی ہوئی کہ جس مقام پر انہیں دل کا شدید درد محسوس ہوا تھا' دل اس سے بالشت بھر دور نکلا۔ ڈاکٹر نے وہم دور کرنے کی غرض سے انگلی رکھ کر بتایا کہ دل یہاں نہیں' یہاں ہوتا ہے۔ سے اس کے بعد انہیں دل کا درد دل ہی میں محسوس ہونے لگا۔

جیسے ہی ان کے کمرے سے "مریض سے ملاقات منع ہے" کی تختی ہٹی' ہم زینیا کا گلدستہ لے کر عیادت کو پہنچے۔ دونوں ایک دوسرے کی شکل دیکھ دیکھ کر خوب روئے۔ نرس نے آ کر دونوں کو چپ کرایا اور ہمیں علیحدہ لے جا کر متنبہ کیا کہ اس ہسپتال میں بیمار پرسی کرنے والوں کو رونا اور کراہنا منع ہے۔ ہم نے فوراً خود پر فرمائشی بشاشت طاری کرکے مرزا کو ہراساں ہونے سے منع کیا اور تلقین کی کہ مریض کو اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ وہ چاہے تو تنکے میں جان ڈال دے۔ ہماری نصیحت کا خاطر خواہ بلکہ اس سے بھی زیادہ اثر ہوا۔

"تم کیوں روتے ہو پگلے؟" ہم نے ان کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "یونہی خیال آ گیا کہ اگر تم مر گئے تو میری عیادت کو کون آیا کرے گا۔" مرزا نے اپنے آنسو نرس کے رومال میں محفوظ کرتے ہوئے وجہ رقت بیان کی۔

مرض کی اصل وجہ ڈاکٹروں کے نزدیک کثرت افکار تھی جسے مرزا کی زبان قادر البیان نے کثرت کار بنا دیا' خیر! اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں تھی۔ تعجب کی بات تو یہ تھی کہ مرزا چائے کے ساتھ آلو کے "چپس" اڑا رہے تھے۔ ہم نے کہا "مرزا' آج تم رنگے ہاتھوں پکڑے گئے۔" بولے (اور ایسی آواز میں بولے گویا کسی اندھے کنوئیں کے پیندے سے بول رہے ہیں) "ڈاکٹر کہتے ہیں تمہارا وزن بہت کم ہے تمہیں آلو اور ایسی چیزیں خود کھانی چاہئیں جن میں اسٹارچ اور کاربوہائیڈریٹ کی افراط ہو۔ صاحب آلو ایک نعمت ہے' کم از کم سائنس کی رو سے۔" ہم نے کہا "تو پھر دبا دب آلو کھا کر ہی صحت یاب ہو جاؤ۔" فرمایا "صحت یاب تو مجھے ویسے بھی ہونا ہی پڑے گا۔ اس لیے کہ نرسیں اس قدر بد صورت ہیں کہ کوئی آدمی جو اپنے منہ پر آنکھیں رکھتا ہے' یہاں زیادہ عرصے پڑا نہیں رہ سکتا۔"

○ وہ نئے گلے' وہ شکایتیں' وہ مزے مزے کی حکایتیں

کلینک سے نکلتے ہی مرزا نے اپنی توپوں کا رخ پھیر دیا۔ خوگر ہجو کے شب و روز اب آلو کی تعریف و توصیف میں بسر ہونے لگے۔ ایک وقت تھا کہ ویت نام پر امریکی بمباری کی خبریں پڑھ کر مرزا پچھتاوا کرتے کہ کولمبس نے امریکہ دریافت کرکے بڑی نادانی کی۔ مگر اب پیار میں اے تو آلو کی گدرائی ہوئی گولائیوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے فرماتے "صاحب! کولمبس جنہم میں نہیں جائے گا۔ اسے واپس امریکہ بھیج دیا جائے گا۔ مہذب دنیا پر امریکہ کے دو احسان ہیں۔ تمباکو اور آلو۔ سو تمباکو کا بیڑا تو سرطان نے غرق کر دیا۔ مگر آلو کا مستقبل نہایت شاندار ہے۔ جو ملک جتنا غربت زدہ ہو گا۔ اتنا ہی آلو اور مذہب کا چلن زیادہ ہو گا۔

اور کبھی ایسا بھی ہوتا کہ حریف ظریف سائنسی ہتھیاروں سے زیر نہیں ہوا تو شاعری کی مار سے وہیں ڈھیر کر دیتے۔ "صاحب! جوں جوں وقت گزرتا ہے یادداشت کمزور ہوتی

چلی جاتی ہے۔ پہلے اپنی پیدائش کا دن ذہن سے اترا۔ پھر مہینہ۔ اور اب تو سن بھی یاد نہیں رہتا۔ بیگم یا کسی بدخواہ سے پوچھنا پڑتا ہے۔ اکثر تمہارے لطیفے تمہیں ہی سنانے بیٹھ جاتا ہوں۔ وہ تو جب تم پیٹ پکڑ پکڑ کر ہنسنے لگتے ہو تو شک گزرتا ہے کہ لطیفہ تمہارا ہی ہو گا۔ بیگم اکثر کہتی ہیں کہ کاک ٹیل پارٹیوں اور ڈانس میں تمہیں یہ تک یاد نہیں رہتا کہ تمہاری شادی ہو چکی ہے۔ غرض کہ حافظہ بالکل چوپٹ ہے۔ اب یہ آلو کا اعجاز نہیں تو اور کیا ہے کہ آج بھی کسی بچے کے ہاتھ میں بھوبل میں سنکا ہوا آلو نظر آ جائے تو اس کی مانوس مہک سے بچپن کا ایک ایک واقعہ ذہن میں تازہ ہو جاتا ہے۔ میں ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھتا ہوں۔ اسے پھوٹتی ہوئی سوندھی بھاپ کے پرے ایک بھولی بسری صورت ابھرتی ہے۔ گرد آلود بالوں کے پیچھے شرارت سے روشن آنکھیں' کرتا بٹنوں سے بے نیاز' گلے میں غلیل' ناخن دانتوں سے کترے ہوئے۔ پتنگ اڑانے والی انگلی پر ڈور کی خون آلود لکیر' بیری سے ہولے ہولے اپنی کینچلیاں اتارتا چلا جاتا ہے۔ اور میں ننگے پاؤں تتلیوں کے پیچھے دوڑتا' رنگ برنگے بادلوں میں ریزگاری کے پہاڑ' پریوں اور آگ اگلتے اژدھوں کو بنتے بگڑتے دیکھتا۔ کھڑا رہ جاتا ہوں۔"

"یہاں تک کہ آلو ختم ہو جاتا ہے۔" ہم نے صابن کے بلبلے پر پھونک ماری۔

سنبھلے' گردش ایام کو اپنے بچپن کے پیچھے دوڑاتے دوڑاتے لگام کھینچی۔ اور گالی دینے کے لیے گلا صاف کرتے ہوئے فرمایا۔ "خدا جانے حکومت آلو کر بزور قانون قومی غذا بنانے سے کیوں ڈرتی ہے۔ سستا اتنا کہ آج تک کسی سیٹھ کو اس میں ملاوٹ کرنے کا خیال نہیں آیا۔ اسکینڈل کی طرح لذیذ اور زود ہضم! وٹامن سے بھرپور' خوش ذائقہ' صوفیانہ رنگ' چھلکا زنانہ لباس کی طرح۔ یعنی برائے نام! ...... صاف ادھر سے نظر آتا ہے ادھر کا پہلو"

○ دستے خود دہان خود

مرزا پر اب یہ جھک سوار تھی کہ اگر صندل کا گھسنا اور لگانا درد سر کے لیے مفید ہے تو اسے اگانا کہیں زیادہ مفید ہونا چاہیے۔ حکمت و زراعت کی جن پر خار راہوں کو مستانہ طے کرکے وہ اس نتیجے پر پہنچے، ان کا اعادہ کیا جائے تو طب پر ایک پوری کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔ از بسکہ ہم حکیموں کی لگی لگائی روزی پہ ہاتھ ڈالنا نہیں چاہیے، اس لیے دو تین چنگاریاں چھوڑ کر دور کھڑے ہو جائیں گے۔

ایک دن ہم سے پوچھا۔ "بچپن میں کھٹے میٹھے بیر، میرا مطلب ہے جھر بیری کے بیر کھائے ہیں؟" عرض کیا "جی ہاں! ہزار دفعہ، اور اتنی ہی دفعہ کھانسی میں مبتلا ہوا ہوں۔"
فرمایا "بس یہی فرق ہے، خرید کے کھانے میں اور اپنے ہاتھ سے توڑ کے کھانے میں۔ تجربے کی بات بتاتا ہوں۔ بیر توڑتے وقت انگلی میں کانٹا لگ جائے اور خون کی بوند پور پر تھرتھرانے لگے تو آس پاس کی جھاڑیوں کے تمام بیر بیٹھے ہو جاتے ہیں۔"
"سائنٹیفک دماغ میں یہ بات نہیں آتی۔" ہم نے کہا۔
ہمارا یہ کہنا تھا کہ زیادہ ابلے ہوئے آلو کی طرح تڑختے بکھرتے چلے گئے۔ کہنے لگے "صاحب! بعضے حکیم یہ کرتے ہیں کہ جس کا معدہ کمزور ہو اسے اوجھڑی کھلاتے ہیں۔ جس کے گردوں کا فعل درست نہ ہو اسے گردے، اور جو ضعف جگر میں مبتلا ہو اسے کلیجی۔ اگر میں حکیم ہوتا تو تمہیں مغز ہی مغز کھلاتا۔
راقم الحروف کے عضو ضعیف کی نشاندہی کرنے کے بعد ارشاد ہوا "اب آلو خود کاشت کرنے کی سائنٹیفک وجہ بھی سن لو۔ پچھلے سال اترتی برسات کی بات ہے۔ میں ٹوبہ ٹیک سنگھ میں کالے تیتر کی تلاش میں کچے میں بہت دور نکل گیا۔ مگر ایک تیتر نظر نہ آیا، جس کی وجہ "گائیڈ" نے یہ بتائی کہ شکار کے لیے آپ کے پاس ڈپٹی کنسٹر کا پرمٹ نہیں ہے۔ سے واپسی میں رات ہو گئی اور ہماری ۱۹۴۵ء ماڈل جیپ پر دمے کا

دورہ پڑا۔ چند لمحوں بعد وہ ضیعفہ تو ایک گڑھے میں آخری ہچکی لے کر خاموش ہو گئی مگر اپنے قفس عنصری میں ہمارے طائر روح کو پرواز کرتا چھوڑ گئی۔ ہم اسٹیرنگ پر ہاتھ رکھے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کر رہے تھے کہ رحمت ایزدی سے جیپ گڑھے میں گری، ورنہ گڑھے کی جگہ کنواں ہوتا تو اس وقت خدا کا شکر کون ادا کرتا؟ نہ کبھی جنازہ اٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا! ہمارے قرض خواہوں پر کیا گزرتی؟ ہمارے ساتھ رقم کے ڈوبنے پر انہیں کیسے صبر آتا کہ ابھی تو ہمارے تمسک کی روشنائی بھی خشک نہیں ہوئی تھی، ہم ابھی ان کے اور ان کے چھوٹے چھوٹے بچوں کی سروں پر ہاتھ پھیر ہی رہے تھے کہ ایک کسان بکری کا نوزائیدہ بچہ گردن پر مفلر کی طرح ڈالے ادھر سے گزرا۔ ہم نے آواز دے کر بلایا۔ ابھی ہم اتنی ہی تمہید باندھنے پائے تھے کہ ہم کراچی سے آئے ہیں اور کالے تیتر کی تلاش میں تھے کہ وہ گڑھے کی طرف اشارہ کرکے کہنے لگا کہ تحصیل ٹوبہ ٹیک سنگھ میں تیتر پانی میں نہیں رہتے۔ ہمارے گائیڈ نے ہماری فوری ضروریات کی ترجمانی کی تو وہ ایسا پسیجا کہ اپنی بیل گاڑی لانے سے اور اسے جیپ میں جوت کر اپنے گھر لے جانے کے لیے اصرار کرنے لگا۔ اور وہ بھی بلا معاوضہ! صاحب! اندھا کیا چاہیے؟"

"دو آنکھیں" ہم نے جھٹ لقمہ دیا۔

"غلط! بالکل غلط! اگر اس کی عقل بھی بینائی کے ساتھ زائل نہیں ہوئی ہے۔ تو اندھا دو آنکھیں نہیں چاہتا، ایک لاٹھی چاہتا ہے۔" مرزا نے محاورے کی بھی اصلاح فرما دی۔

ہم ہونکارا بھرتے رہے، کہانی جاری رہی۔ "تھوڑی دیر بعد وہ بیل گاڑی لے آیا جس کے بیل اپنی جوانی کو بہت پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ ادوان کی رسی سے جیپ باندھتے ہوئے اس نے ہمیں بیل گاڑی میں اپنے پہلو میں اگلی سیٹ کی پیش کش کی۔ اور ڈیڑھ دو میل دور کسی موہوم نقطے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تسلی دینے لگا۔

"او جہڑی نویں لالٹین بلدی پئی اے نا، اوہی میرا گھر وے۔"

گھر پہنچتے ہی اس نے اپنی پگڑی اتار کر چارپائی کے سیروے والے پائے کو پہنا دی۔ منہ پر پانی کے چھپکے دیے اور گیلے ہاتھ سفید بکری کی پیٹھ سے پونچھے۔ برسات کی چاندنی میں اس کے کرتے پر بڑا سا پیوند دور سے نظر آ رہا تھا۔ اور جب تھونی پر لٹکی ہوئی نئی لالٹین کو لو بھڑکی تو اس پیوند میں لگا ہوا ایک اور پیوند بھی نظر آنے لگا جس کے ٹانکے ابھی اس کی مسکراہٹ کی طرح اجلے تھے۔ اس کی گھر والی نے کھری چارپائی پر کھانا چن کر ٹھنڈے میٹھے پانی کے دو دھات کے گلاس پٹی پر بان چھدرا کرکے جما دیئے۔ میزبان کے شدید اصرار اور بھوک کے شدید تر تقاضے سے مجبور ہو کر جو ہم نے خشک چنائی شروع کی ہے تو یقین مانو پیٹ بھر گیا مگر جی نہیں بھرا۔ سے رال نکلتے ہوئے ہم نے پوچھا' چودھری اس سے مزیدار آلو کا ساگ ہم نے آج تک نہیں کھایا۔ کیا ترکیب ہے پکانے کی؟"

بولا "بادشاہو! پہلے تو ایک کلے زمین وچ پنج من امریکہ دی کھاد پاؤ فیر......"

○ قصہ آلو کی کاشت کا

بات اگر اب بھی گلے سے نہیں اتری' تو "خود اگاؤ' خود کھاؤ" سلسلے کی تیسری داستان سنئے جس کا عذاب ثواب مرزا کی گردن پر ہے کہ وہی اس کے فردوسی ہیں اور وہی رستم۔ داستان کا آغاز یوں ہوتا ہے۔

"صاحب! بازار سے سڑے بسے آلو خرید کر کھانے سے تو یہ بہتر ہے کہ آدمی چنے بھسکتا پھرے۔ پرسوں شام ہم خود آلو خریدنے گئے۔ شبراتی کی دکان سے۔ ارے صاحب! وہی اپنا شبراتی جس نے چودہ پندرہ سال سے وہ سائن بورڈ لگا رکھا ہے۔

مالک ایں دکان شبراتی مہاجرین (گر کوئے دعویٰ کند باطل شود)

بمقام موضع کاٹھ' عقب جامع مسجد کلاں

پوسٹ آفس قصبہ باغپت' ضلع میرٹھ' حال مقیم کراچی

ہم نے ایک آلو دکھاتے ہوئے کہا "میاں شبراتی! حال مقیم کرانچی' تمہارے آلو تو پلپلے ہیں خراب لگتے ہیں۔ بولا "باؤ جی! خراب نکلیں تو کالا ناگ (اس کے گدھے کا نام) کے موت سے مونچھ منڈوا دینا۔ در حقیقت یہ پہاڑی آلو ہیں۔" ہم نے کہا "ہمیں تو کراچی سے پانچ سو میل تک کوئی پہاڑ نقشے میں نظر نہیں آتا۔" بولا "باؤ جی تمہارے نقشے میں اور کون سی پھل پھلاری کرانچی میں نجر آوے ہے۔ یہ رپے چھٹانک کا سانچی پانچ جو تمہارے غلام کے کلے میں بتاشے کی طرح طریوں گھل ریا ہے' بمقام بنگال سے آ ریا ہے۔ یہاں کیا دم درود رکھا ہے۔ حالیت تو یہ ہے باؤ جی! کرانچی میں مٹی تلک ملیر سے آوے ہے۔ کس واسطے کہ اس میں ڈھاکہ سے منگا کے گھانس لگاویں گے۔ جوانی قسم باؤ جی! پشاور کے چوک یادگار میں مرغا اذان دیوے ہے تو کہیں جا کے کرانچی والوں کو صبح انڈا نصیب ہووے ہے۔

اور ایک مرد غیرت مند نے چمن زار کراچی کے دل یعنی ہاؤسنگ سوسائٹی میں آلو کی کاشت شروع کر دی۔ اگرچہ سردست پانچ من امریکی کھاد کا انتظام نہ ہو سکا۔ لیکن مرزا کا جوش جنوں انہیں اس مقام پر پہنچا چکا تھا' جہاں کھاد تو کھاد' وہ بغیر زمین کے بھی کاشت کرنے کا جگرا رکھتے تھے۔

مرزا عبدالودود بیگ اور کھیتی باڑی! ہمارا خیال ہے کہ سارا کھیت ائیر کنڈیشن کر دیا جائے اور ٹریکٹر میں ایک راکنگ چیئر (جھولا کرسی) ڈال دی جائے تو مرزا شاید دو چار گھنٹے کے لیے کاشت کاری کا پیشہ اختیار کر لیں' جس کے بارے میں ان کا مبلغ علم بس اس قدر ہے کہ انہوں نے سینما کے پردے پر کلین شیو ایکٹروں کو چھاتی پر چھاتی پہ مصنوعی بال چپکائے' اسٹوڈیو کے سورج کی دھوپ میں' سگریٹ کی پنی چڑھی ہوئی درانتیوں سے باجرے کے کھیت میں سے مکا کے بھٹے کاٹتے دیکھا ہے۔ یہاں یہ بتانا غالباً بے محل نہ ہو گا کہ اس سے چند سال پیشتر مرزا باغبانی کا ایک انتہائی نادر اور اتنا ہی ناکام تجربہ کرکے ہمیں ایک مضمون کا خام مواد مہیا کر چکے تھے۔ انہیں ایک دن اپنے کوٹ کا

ننگا کالر دیکھ کر دفعتہً القا ہوا کہ ہونے کو تو گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ ہے سوائے روپے کے، لیکن اگر باغ میں گلاب کے گملے نہیں تو جینا فضول ہے۔ انہیں زندگی میں اچانک ایک زبردست خلا محسوس ہونے لگا، جسے صرف امریکی کھاد سے پر کیا جا سکتا تھا۔

اب جو آلو کی کاشت کا سودا سر میں سمایا تو ڈیڑھ دو ہفتے فقط اس موضوع پر ریسرچ ہوتی رہی کہ آلو بخارے کی طرح آلو کے بھی بیج ہوتے ہیں، یا کوئٹہ کے گلاب کی طرح آلو کی بھی ٹہنی کاٹ کر صاف ستھرے گملے میں گاڑ دی جاتی ہے۔ نیز آلو پٹ سن کی مانند گھٹنوں گھٹنوں پانی مانگتا ہے یا اخروٹ کی طرح بغیر محنت کے پشتہا پشت تک پھل دیتا رہے گا۔ دوران تحقیق ایک شق کہیں سے یہ بھی نکل آئی کہ بینگن کی طرح آلو بھی ڈال ڈال کر پہ لٹکیں گے یا ترئی کی بیل کی طرح پڑوسی کی دیوار پہ پڑے رہیں گے۔ پروفیسر قاضی عبدالقدوس نے تو یہ شوشہ بھی اٹھایا کہ اگر رفع شر کی خاطر یہ مان لیا جائے کہ آلو واقعی زمین سے اگتے ہیں تو ڈنٹھل کا نشان کیسے مٹایا جاتا ہے؟

○ چھپا دست ہمت میں دست قضا ہے

پھر کیا تھا، کوئٹہ سے بذریعہ پی آئی اے سفید گلاب کی قلمیں منگائی گئیں۔ گملوں کو کھولتے پانی اور فنائل سے "ڈس انفکٹ" کیا گیا۔ پھر کوئٹہ کے نازک و نایاب گلاب کو کراچی کی دیمک اور کیڑوں سے محفوظ رکھنے کے لیے اوباش بکری کی مینگنی کی گرم کھاد میں اتنی ہی امریکی کھاد میں ہم وزن ڈی ڈی ٹی پاؤڈر ملایا گیا۔ ابلے ہوئے پانی سے صبح و شام سینچائی کی گئی۔ اور یہ واقعہ ہے کہ ان گملوں میں کبھی کوئی کیڑا نظر نہیں آیا۔ اور نہ گلاب!

پروفیسر قاضی عبدالقدوس کچھ غلط تو نہیں کہتے کہ مرزا حماقت بھی کرتے ہیں تو اس قدر "اوریجنل" کہ بخدا بالکل الہامی معلوم ہوتی ہے۔

پایان کار مرزا نے آلو کی کاشت کے لیے زمین یعنی اپنا "لان" (جس کی افریقی گھاس کی ہریالی ایسی تھی کہ سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے دل دکھتا تھا) تیار کیا۔ اس زراعتی تجربے کے دوران جہاں جہاں عقل محو تماشائے لب بام رہی' وہاں جوش نمرود بے خطر گلزار خلیل میں کود پڑا۔ دفتر کے چپڑاسیوں' اپنے پالتو خرگوش اور محلے کے لونڈے لاڑھیوں کی مدد سے دو ہی دن میں سارا لان کھود پھینکا۔ بلکہ اسکے بعد بھی یہ عمل جاری رکھا۔ سے یہاں تک کہ دوسری منزل کے کرایہ داروں نے ہاتھ پاؤں جوڑ کے کھدائی رکوائی' اس لیے کہ مکان کی نیو نظر آنے لگی تھی۔

O ۳۲/س+ کے×موزہ = کمر

کوئٹہ کے گلاب کی طرح آلو کو بھی کراچی کی نظر کھا گئی۔ مگر پنج وقتہ نلائی' گوڑائی اور کھدائی سے رگ پٹھوں میں جو چستی اور طبیعت میں چونچالی آ گئی تھی' وہ اسے آلو کی کرامات سمجھتے تھے۔ اب کی دفعہ جو لنچ پر ہمیں ہوٹل انٹر کانٹی ننتل کے چاندنی لاؤنج میں لے گئے۔ تو ہم نے دیکھا کہ بوفے پر سوائے ان کیمیائی تجربات کے جو یورپین باورچیوں نے نسلاً بعد نسل آلو پر کئے تھے اور کچھ نہ تھا۔ آلو مسلم' آلو دو نیم' آلو سوختہ و کوفتہ' آلو چھلکے دار' آلو بریاں' آلو نیم بریاں' بلکہ کہیں کہیں بالکل عریاں!

"مرزا یہ کیا؟"

"ٹرپل بی (Busy Bussinessmen's Buffet)"

"یا اللہ کراچی کے کروڑ پتی یہ کھاتے ہیں۔ سے مگر ہم نے تو انکم ٹیکس کی چوری بھی نہیں کی۔ پھر یہ سزا کیوں؟ بھوکا ہی مارنا تھا تو ہمیں گز بھر کی ٹائی بندھوا کے نو منزلیں لانگتے پھلانگتے یہاں کاہے کو لائے؟ نیچے ہی نقد پیسے دے کر رخصت کر دیتے۔"

"ہماری صحبتیں اٹھاتے ایک عمر گزری' مگر رہے جنگلی کے جنگلی! تمہیں معلوم ہونا چاہیے'

کہ فائیو اسٹار (اعلیٰ درجہ) ہوٹلوں میں قیمت کھانے کی نہیں دی جاتی' اس رومانی فضا کی دی جاتی ہے' جہاں آپ دوسرے معززین کو اپنی طرح بھوکا مرتا دیکھتے ہیں۔ بل میں جو رقم درج ہوتی ہے وہ بساندے گوشت اور ابلے چقندر کی قیمت نہیں ہوتی۔ دراصل اس میں گھر سے بھاگنے کا جرمانہ' دوسرے میزوں پر بیٹھی ہوئی خواتین کے فرنچ سینٹ لگانے کا تاوان' کھلکھلاتی ہوئی ویٹرس کے ٹوتھ پیسٹ کی قیمت بلکہ اس کا پورا نان نفقہ شامل کرنا پڑتا ہے۔ جب جا کے کہیں ایک بل بنتا ہے اور جہاں تک لذت کا تعلق ہے تو صاحب! ہر شب آنگن میں اترنے والے من و سلویٰ کے مقابلے میں باہر کی پیاز کی گنٹھی مزا دے جاتی ہے۔ ورنہ دیکھا جائے تو چائے کی پیالی گھر کی انگیٹھی پر "چراغ تلے" جلا کر بھی بنائی جا سکتی ہے اور ...... اور صاحب! دس دس روپے کے نوٹ جلا کر بھی! جیسا باکس بے کی "ہٹ" میں تمہارے اس بمباء سیٹھ نے کیا تھا۔

"مصری بیلی ڈانسر کی خاطر"

"مگر وہ تو خاصی Plump تھی۔"

"صاحب! مصری تو اسی چیز پر جان دیتے ہیں۔ جبھی تو شاہ فاروق فربہ اندام داشتائیں اسی طرح اکٹھی کیا کرتا تھا۔ جیسے بچے ڈاک کے ٹکٹ جمع کرتے ہیں۔"

بحث اور ہمیں اس ڈھلوان پر لا کر مرزا نے سراپا کے اعداد ثلاثہ (مثلاً ۳۷-۲۴-۳۵) کی جانچ پڑتال کرنے کا خود ساختہ فارمولا پیش کیا جو بے کم و کاست نذر قارئین ہے۔

نازنین کے سینے کے ناپ میں کولھوں جوڑو۔ میزان کو اپنے (صاف) موزے کے نمبر سے ضرب دو۔ پھر اس حاصل ضرب کو ۳۲ سے تقسیم کر دو۔ جو جواب آئے وہ کمر کا مثالی ناپ ہو گا۔ اب اگر کمر کا پھیر اس سے زیادہ نکلے تو آلو سے پرہیز سے لازم ہے اور اگر اس سے کم ہے تو آلو کھلا کھلا کر جسم کو فارمولے کے سانچے میں ڈھالا جا سکتا ہے۔

ہوٹل کے بل کی پشت پر انھوں نے بال پوائنٹ قلم سے مارلن منرو' جینا لولو بریجیڈا'

الزبتھ ٹیلر' صوفیہ لارین اور چیدہ چیدہ پری پیکروں کو ایک ایک کرکے اپنے گیارہ نمبر کے موزے میں ایسا اتارا کہ ہم بھونچکے رہ گئے۔ اس میں آپ کو جھوٹ یا عبارت آرائی کا ذرا بھی شائبہ نظر آئے تو دو چار مشقی سوال نکال کر آپ بھی اپنی جان پہچان کے حسینوں کا امتحان کر لیجئے۔ ہم تو اسے ملکہ وکٹوریہ کے بت' کوکا کولا کی بوتل اور خود پر پر آزما کر اپنا اطمینان کر چکے ہیں۔

○ ..... اس کی شبوں کا گداز

ہمیں ڈیڑھ مہینے کے لیے کام سے ڈھاکہ جانا پڑا اور مرزا سے ملاقاتی کا سلسلہ موقوف ہو گیا۔ خط و کتابت کا مرزا کو دماغ نہیں۔ جیسے ہی ہم واپس آئے' اناس اور گنج کے کیلوں سے لدے پھندے مرزا کے ہاں پہنچے۔ ہم نے کہا۔ "السلام علیکم" جواب ملا "پھل اندر پہنچوا دو۔ وعلیکم السلام" غور سے ان کی صورت دیکھی تو دل پہ چوٹ سی لگی۔

"یہ کیا حال بنا لیا تم نے؟"

"ہمیں جی بھر کے دیکھ لو۔ پھر اس صورت کو ترسو گے۔ اشتہا ختم۔ دواؤں پر گزارا ہے۔ دن بھر میں تین انگور کھا پاتا ہوں۔ وہ بھی چھلکا اتار کے۔ کھانے کے نام سے ہول اٹھتا ہے۔ دل بیٹھا جاتا ہے۔ ہر وقت ایک بیکلی سے رہتی ہے۔ ہر چہرہ اداس اداس' ہر شے دھواں دھواں۔ یہ ہو نکتا سناٹا۔ یہ چیت کی اداس چاندنی' یہ..."

"مرزا' ہم تمہیں رومینٹک ہونے سے روک تو نہیں سکتے لیکن یہ مہینہ چیت کا نہیں ہے۔"

"چیت نہ سہی' چیت جیسا ضرور ہے' ظالم۔ تم تو ایک ہندو لڑکی سے دل بھی لگا چکے ہو۔ تمہی بتاؤ' یہ کون سے مہینے کا چاند ہے؟" مرزا نے سوال کیا۔

"اسی مہینے کا معلوم ہوتا ہے۔" ہم نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔

"ہمیں بھی ایسا ہی لگتا ہے۔ صاحب! عجیب عالم ہے' کام میں ذرا جی نہیں لگتا۔ کام

میں ذرا جی نہیں لگتا اور بیکاری سے بھی وحشت ہوتی ہے۔ ذہن پراگندہ بلکہ سچ پوچھو تو محض گندہ۔ تاروں بھرے آسمان کے نیچے رات رات بھر آنکھیں پھاڑے تمہاری حماقتیں گنتا رہتا ہوں۔ تنہائی سے دل گھبراتا ہے۔ اور لوگوں سے ملتا ہوں' تو جی چاہتا ہے منہ نوچ لوں' اور صاحب! ایک دو کا ذکر کیا' سارے کے سارے نوچ لوں۔

"مرزا' ہو نہ ہو یہ عشق کے آثار ہیں۔"

"بجا' لیکن اگر صاحب معاملہ پر چالیس مہاوٹیں پڑ چکی ہوں' تو یہ آثار عشق کے نہیں' السر کے ہیں۔ کھانا کھاتے ہی محسوس ہوتا ہے گویا کسی نے حلق سے لے کر معدے تک تیزاب کی پھریری پھیر دی ہے۔ ادھر کھایا' ادھر پیٹ پھول کر مشکیزہ ہوا' ہنسی کا رخ بھی اندر کی طرف ہو گیا ہے۔ سارا فتور آلو کا ہے۔ معدے میں "ایسڈ " بہت بننے لگا ہے۔ پیپٹک السر ہو گیا ہے۔" ان کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

"اس میں ہراساں ہونے کی کیا بات ہے۔ آج کل کسی کو ہارٹ اٹیک یا السر نہ ہو تو لوگ اس پر ترس کھانے لگتے ہیں کہ شاید بیچارہ کسی ذمہ دار عہدے پر فائز نہیں ہے۔ مگر تم تو ملازمت کو جوتے کی نوک پر رکھتے ہو۔ اپنے باس سے ٹانگ پہ ٹانگ رکھ کر بات بات کرتے ہو۔ پھر یہ کیسے ہوا؟ وقت پر سوتے ہو' وقت کے بعد اٹھتے ہو۔ دادا کے وقتوں کی چاندی کی پتیلی میں ابالے بغیر پانی نہیں پیتے۔ وضو بھی پانی میں' لسٹرین ملا کر کرتے ہو' جس میں ۲۶ فیصد الکوحل ہوتا ہے۔ حالات حاضرہ سے خود کو بے خبر رکھتے ہو۔ باتوں کے علاوہ کسی چیز میں ترشی کو روا نہیں رکھتے۔ تیل بھی تم نہیں کھاتے' دس سال سے تو ہم کود دیکھ رہے ہیں' منٹگمری کا خالص دانے دار گھی کھا رہے ہو۔" ہم نے کہا۔

"تمہیں یقین نہیں آئے گا۔ یہ سب اسی منحوس کا فتور ہے۔ اب کی دفعہ جو سونے کے کشتہ سے زیادہ طاقت بخش گھی کا سربمہر کنستر اپنے ہاتھ سے انگیٹھی پر تپایا تو معلوم

ہے تہ میں کیا نکلا؟ تین تین انگل آلو کی دانے دار لگدی! جبھی تو میں کہوں کہ میرا بنیان تو تنگ ہو گیا' مگر وزن کیوں نہیں بڑھ رہا۔" مرزا نے آخر اپنے دس سالہ مرض کی جڑ پکڑ لی جو ضلع منٹگمری تک پھیلی ہوئی تھی۔

○ کیا اسیری ہے' کیا رہائی ہے

پہلے مرزا کو درد کی ذرا برداشت نہیں تھی۔ ہمارے سامنے کی بات ہے' پہلی دفعہ پیٹ میں درد ہوا تو ڈاکٹر نے مارفیا کا انجکشن تیار کیا۔ مگر مرزا نے گھگیا کر منتیں کیں کہ انہیں پہلے کلوروفام سنگھا دیا جائے تا کہ انجکشن کی تکلیف محسوس نہ ہو۔ لیکن اب اپنی بیماری پر اس طرح اترانے لگے تھے جیسے اکثر اوچھے اپنی تندرستی پر اکڑتے ہیں۔ ہمیں ان کی بیماری سے اتنی تشویش نہیں ہوئی جتنی اس بات سے کہ انہیں اپنے ہی نہیں پرائے مرض میں بھی اتنی ہی لذت محسوس ہونے لگی تھی۔ بھانت بھانت کی بیماریوں میں مبتلا مریضوں سے اس طرح کرید کرید کر متعدی تفصیلات پوچھتے کہ رات تک ان کے سارے مرض اپنا لیتے۔ اس حد تک کہ بخار کسی کو چڑھتا' سرسامی باتیں وہ کرتے۔ اس ہمدردانہ طرز عیادت سے مرزا نے خود کو زچگی کے سوا ہر قسم کی تکلیف میں مبتلا کر لیا۔ گھر یا دفتر کی قید نہیں' نہ اپنے بیگانے کی تخصیص' ہر ملاقاتی کو اپنی آنتوں کے ناقص فعل سے آگاہ کرتے اور اس سیماب صفت سیاحی درد کا لفظی گراف بناتے جو مصافحہ کرتے وقت نفخ و قراقر کا محرک تھا۔ پھر دائیں آنکھ کے پپوٹے میں "کرنٹ" مارتا' متورم جگر کو چھیدتا' ٹلی ہوئی ناف کی طرف بڑھنے لگا تھا کہ پچھلے پہر اچانک پلٹا اور پلٹ کر دل میں برے برے خیال پیدا کرنے لگا۔ اور پھر مرزا ہر برے خیال کو اس طرح کھول کر بیان کرتے کہ

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

جن لوگوں نے مرزا کو پہلے نہیں دیکھا تھا وہ تصور نہیں کر

سکتے تھے کہ یہ مرد بیمار جو فائلوں پر سر جھکائے السر کی ٹیس مٹانے کے لیے ہر دوسرے گھنٹے ایک گلاس دودھ منہ بنا کر پی لیتا ہے، یہ چار مہینے قبل کوفتے میں ہری مرچ بھروا کر کھاتا تھا اور اس سے بھی جی نہیں بھرتا تو شام کو یہی کوفتہ ہری مرچ میں بھروا دیتا۔ یہ نیم جاں جو بے مرچ مسالے کے راتب کو "انگلش فوڈ" کہہ کر صبر و شکر کے ساتھ کھا رہا ہے، یہ وہی چٹورا ہے جو چار مہینے پہلے یہ بتا سکتا تھا کہ صبح سات بجے سے لے کر رات کے نو بجے تک کراچی میں کس "سویٹ میٹ مرچنٹ" کی کڑھائی سے اترتی گرم جلیبی مل سکتی ہے۔ ہاؤسنگ سوسائٹی کے کون سے چینی ریستوران میں تلے ہوئے جھینگے کھانے چاہئیں جن کا چوگنا بل بناتے وقت مالک ریستوران کی بیٹی اس طرح مسکراتی ہے کہ بخدا روپیہ ہاتھ کا میل معلوم ہوتا ہے۔ انہیں نہ صرف یہ پتہ تھا کہ لاہور میں زیورات کی کون سی دکان میں نہایت سبک "ہیرا تراش" کلائیاں دیکھنے کو ملتی ہیں، بلکہ یہ بھی معلوم تھا کہ مزنگ میں تکا کباب کی وہ کون سی دکان ہے جس کا ہیڈ آفس گوجرانوالہ میں ہے اور یہ بھی کڑکڑاتے جاڑوں میں رات کے دو بجے سے لال کڑتی کی کس پان کی دکان پر پنڈی کے من چلے طرح طرح کے پانوں سے زیادہ ان کے رسیلے ناموں کے مزے لوٹنے آتے ہیں۔ قصہ خوانی کے کس مچھیل حلوائی کی دکان سے کالی گلاب جامن اور ناظم آباد کی کون سی چورنگی کے قریب گلاب میں بسا ہوا قلاقند قرض پر مل سکتا ہے۔ (اطلاعاً عرض ہے کہ مرزا نقد پیسے دے کر مٹھائی خریدنا فضول خرچی سمجھتے ہیں) بھلا کوئی کیسے یقین کر لیتا کہ یہ آلو اور "کاربوہائیڈریٹ" کا شکار وہی ہے جس نے کل تک من بھاتے کھانوں کے کیسے کیسے البیلے جوڑے بنا رکھے تھے۔ کھڑے مسالے کے پسندے اور بیسنی روٹی، قیمہ بھرے کریلے اور گھی میں تر تراتے پراٹھے، مدراسی بریانی اور پارسی کوفتے (وہ بھی ایک لکھنؤی پڑوسن" کے ہاتھ کے) چپڑی روٹی اور ارد کی پھریری دال، بھنڈی اور ...... بھنڈی! (بھنڈی کے ساتھ مرزا کسی اور چیز کو شامل کرنے کے روادار نہیں)

مرزا کو کھانے کا ایسا ہوکا ہے کہ ایک منہ انہیں ہمیشہ ناکافی معلوم ہوتا ہے۔ ان کے ندیدے پن کو دیکھ کر ایک دفعہ پروفیسر قاضی عبدالقدوس نے کہا تھا "مرزا تمہارا حال گرگٹ جیسا ہے۔ اس کی زبان کی لمبائی اس کے جسم کی آدھی ہوتی ہے۔" مرزا کی اداس آنکھیں ایک دم مسکرا اٹھیں۔ کہنے لگے "صاحب! خدا نے ایک پارۂ گوشت کو جانے کس لذت سے ہمکنار کر دیا۔ اگر سارا بدن اس لذت سے آشنا ہو جاتا تو انسان اس کی تاب نہ لاتا۔ زمین کی چھاتی پھٹ جاتی۔"

مرزا پانچ چھ ہفتے میں پلنگ کو لات مار کر کھڑے ہو گئے۔ ہم تو اسے ان کی قوت ارادی کی کرامات ہی کہیں گے' حالانکہ وہ خود کچھ اور وجہ بتاتے تھے۔ ایک دن ان کے معدے سے خون کٹ کٹ کر آنے لگا۔ ہمیں چشم پر آب دیکھا تو ڈھارس دینے لگے "میں مسلمان ہوں' جنت کا بھی قائل ہوں۔ مگر مجھے وہاں جانے کی جلدی نہیں ہے۔ میں موت سے نہیں ڈرتا۔ مگر میں ابھی مر نہیں سکتا۔ میں ابھی مرنا نہیں چاہتا۔ اس لیے کہ اول تو تم میری موت کا صدمہ برداشت نہیں کر سکو گے۔ دوم' میں پہلے مر گیا تو تم مجھ پر مضمون لکھ دو گے۔" خدا بہتر جانتا ہے کہ وہ خوف خاکہ سے صحت یاب ہوئے یا بقول شخصے مرغی کے غسل میت کے پانی سے جسے وہ چکن سوپ کہہ کر نوش جان فرما رہے تھے۔ بہرحال بیماری جیسے آئی تھی' اسی طرح چلی گئی۔ فائدہ یہ ہوا کہ آلو سے جو بیزاری پہلے بلا وجہ تھی' اب اس کی نہایت معقول وجہ ہاتھ آ گئی۔ اور یہ سراسر مرزا کی اخلاقی فتح تھی۔

مرض الحمد للہ دور ہو چکا تھا۔ پرہیز البتہ جاری تھا۔ وہ اس طرح کہ پہلے مرزا دوپہر کے کھانے کے بعد آدھ سیر جلیبی اکیلے کھا جاتے تھے لیکن اب ڈاکٹروں نے میٹھابند کر دیا تھا۔ لہٰذا آدھ سیر امرتی پر اکتفا کرتے تھے۔

○ آلو کا منہ کالا' بھنڈی کا بول بالا

جیسے ہی مرزا کی صحت اور طبیعت معمول پر آئی' بغدادی جم خانہ میں یار لوگوں نے شایان شان پیمانے پر غسل صحت کے جشن کا اہتمام کیا۔ استقبالیہ کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ گھسے پٹے ڈنر ڈانس کے بجائے فینسی ڈریس بال کا اہتمام کیا جائے تا کہ ایک دوسرے پر ہنسنے کا موقع ملے۔ مہمان خصوصی تک یہ بھنک پہنچی تو انہوں نے ہماری زبانی کہلا بھیجا کہ نئے مضحکہ خیز لباس سلوانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ممبران اور ان کی بیگمات اگر ایمانداری سے وہی کپڑے پہنے پہنے جم خانہ چلے آئیں' جو وہ عموماً گھر میں پہنے بیٹھے رہتے ہیں تو منشا پورا ہو جائے گا۔ رقص کے لیے البتہ ایک کڑی شرط مرزا نے یہ لگا دی کہ ہر ممبر صرف اپنی بیوی کے ساتھ رقص کرے گا مگر اس لپک اور ہمک سے گویا وہ اس کی بیوی نہیں ہے۔ جشن کی رات جم خانہ کو جھنڈیوں اور بھنڈیوں سے دلہن بنایا گیا۔ سات کورس کے ڈنر سے پہلے روئی اور کاغذ سے بنے ہوئے ایک قد آدم آلو کی ارتھی نکالی گئی' جس پر مرزا نے اپنے ہاتھ سے برانڈی چھڑک کر ماچس دکھائی اور سرگباشی کے "ڈمپل" پر گاف کلب مار کے کریا کرم کیا۔ ڈنر کے بعد مرزا پر ٹائلٹ پیپر کے پھول برسائے گئے اور کچی کچی بھنڈیوں میں تولا گیا جن پر ابھی ٹھیک سے سنہری رواں بھی نہیں نکلا تھا۔ پھر یہ بھنڈیاں مستحقین یعنی معدے کے لکھ پتی مریضوں میں تقسیم کر دی گئیں۔ شمپین سے مہکتے ہوئے بال روم میں غبارے چھوڑے گئے۔ خالی بوتلوں کی قیمت کا عطیہ ایک یتیم خانہ کو دینے کا اعلان کیا گیا۔ اور غسل صحت کی خوشی میں کارڈ روم والوں نے جوئے کے اگلے پچھلے سارے قرضے معاف کر دیئے۔

مرزا بات بے بات مسکرا رہے تھے۔ تیسرا رقص ختم ہوتے ہی ہم اپنی کہنیوں سے راستہ بناتے ہوئے ان تک پہنچے۔ وہ اس لمحے ایک بڑے غبارے میں جلتے ہوئے سگریٹ سے سوراخ کرنے چلے تھے کہ ہم نے اس کا ذکر چھیڑ دیا جس کی جناب میں کل تک گستاخی فرشتہ پسند نہ تھی۔ "مرزا' آلو اگر اتنا ہی مضر ہے تو انگلینڈ میں اس قدر مقبول

کیوں ہے؟ ایک انگریز اوسطاً دس اونس آلو یومیہ کھا جاتا ہے۔ یعنی سال میں ساڑھے پانچ من! سن رہے ہو۔ ساڑھے پانچ من" بولے "صاحب' انگریز کی کیا بات ہے۔ اس کی مفلسی سے بھی ایک شان ٹپکتی ہے۔ وہ پٹتا بھی ہے تو ایک ہیکڑی کے ساتھ! لن یوتانگ نے کہیں لکھا ہے کہ ہم چینیوں کے بارے میں لوگوں نے یہ مشہور کر رکھا ہے کہ قحط پڑتا ہے تو ہم اپنے بچے تک کھا جاتے ہیں۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ ہم انہیں اس طرح نہیں کھاتے جس طرح انگریز "بیف" کھاتے ہیں یعنی کچا۔" ہم بھی جواباً کچھ کہنا چاہتے تھے کہ ایک نکیلی ایڑی جو ایک حسین بوجھ سہارے ہوئے تھے۔ ہمارے پنجے میں برمے کی طرح اترتی چلی گئی۔ ہماری مردانہ چیخ

For He is a Jolly good fellow

کے کورس میں دب گئی۔ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے کا برمی ساگوان کا ڈانس فلور بھکے بھکے قدموں تلے پھر چرچرانے لگا۔

○○○

• پروفیسر

آج پھر ان کے اعزاز میں حضرت رنجور اکبر آبادی، ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر و پروف ریڈر، سہ ماہی "نیا افق" نے ایک عصرانہ دیا تھا۔

جس دن سے پروفیسر قاضی عبدالقدوس ایم اے، بی ٹی گولڈ میڈلسٹ (مرزا سے روایت ہے کہ یہ طلائی تمغہ انہیں مڈل میں بلا ناغہ حاضری پر ملا تھا) یونیورسٹی کی ملازمت سے مستعفی ہونے کے بعد بنک آف چاکسو لمیٹڈ میں بحیثیت ڈائریکٹ پبلک ریلیشنز اینڈ ایڈورٹائزنگ دھانس دیئے گئے تھے، ان کے اعزاز میں اس قسم کے عصرانے، استقبالیے اور عشایئے روزمرہ دفتری زندگی کا جزو بلکہ جزو بدن بن گئے تھے۔ گھر پر اکل حلال تو صرف دوران علالت ہی زہر مار فرماتے تھے۔ ورنہ دونوں وقت "اعزازیہ" کھاتے تھے۔ بنک کی ملازمت پروفیسر موصوف کے لیے ایک عجیب تجربہ ثابت ہوئی جس کی قیمت وہ بہر طور مہینے کی تیس تاریخ کو وصول کر لیتے تھے۔

معاف کیجئے، اس خاکے میں ہم انہیں پروفیسر ہی کہیں گے۔ بقول مرزا، آدمی ایک دفعہ پروفیسر ہو جائے تو عمر بھر پروفیسر ہی کہلاتا ہے، خواہ بعد میں سمجھداری کی باتیں ہی کیوں نہ کرنے لگے۔ درس و تدریس تو ایک حیلہ شرعی تھا، ورنہ بقول مولانا محمد حسین آزاد "پروفیسر کا پیشہ توکل تھا اور بے دماغی سے اسے رونق دیتے تھے۔"

وہ کسی کے دبیل نہیں تھے۔ دبنگ اور دلیر آدمی تھے اور خطرے سے ڈرنا یا بچنا تو کجا، بسا اوقات سانپ کو رسی سمجھ کر گیتہ مرتے تھے۔ ان کی جرات اب شجاعت سے گزر کر تہور، اور تہور سے گزر کر حماقت کی ماورائی حدوں میں داخل ہو چکی تھی۔ کوئی شخص ان سے ملازمت، بحث یا برج میں سبقت لے جائے تو اس کے پورے صوبے سے نفرت ہو جاتی تھی۔ برصغیر پاک و ہند کا کوئی صوبہ بچا ہو گا جس سے ان کی ذاتی عداوت نہ ہو، بلکہ اب تو چھوٹی چھوٹی تحصیلیں آنکھیں دکھانے لگی تھیں۔

وائس چانسلر کو بھری میٹنگ میں "شٹ اپ" کہنے کے بعد وہ تین مہینے کی رخصت لے کر گھر بیٹھ گئے۔ اور احتجاجاً اخبار تک پڑھنا ترک کر دیا کہ اس میں گاہے ماہے وائس چانسلر کی تصویر چھپ جاتی تھی۔ یوں بھی انہوں نے زندگی بھر زبان کے علاوہ کسی دوسرے عضو کو تکلیف نہیں دی تھی، لیکن اب چوبیس گھنٹے میں ایک دفعہ بلا کی چستی دکھاتے تھے۔ وہ اس وقت جب دن بھر آرام کرسی پر اونگھتے رہنے کے بعد وہ شام کو آٹھ بجے سونے کے لیے بڑی پھرتی سے جست لگا کر پلنگ پر چڑھتے تھے۔ اپنے پیشے سے تنگ آ چکے تھے اور کہتے تھے کہ تمہارا خیال آ جاتا ہے ورنہ اکثر جی میں آتا ہے کہ گھر کو آگ لگا کر کسی غیر آباد جزیرے میں ایک لوٹا، ڈور، فروٹ سالٹ اور دیوان غالب لے کر چلا جاؤں۔

عالم بیزاری میں ایک دن پاک بوہیمین کافی ہاؤس میں نتھنوں کی چمنی سے King Stork سگریٹ کا دھواں خارج کرنے کے بعد کرسی پر اکڑوں بیٹھ گئے اور مٹھی بھینچ کر کہنے لگے۔ "اگر میں اس ملک کا پرائم منسٹر ہوتا تو......"

"تو......؟" ہم نے پوچھا۔

"تو یونیورسٹی میں نوکری نہیں کرتا۔" انہوں نے مٹھی کھول دی۔

وہ پرائم منسٹر ضرور ہونا چاہتے تھے، مگر جس مقدار میں وہ ذہنی سکون اور فرصت چاہتے تھے، وہ ہمارے ہاں صرف پرائمری سکول کے ماسٹر کا حصہ ہے۔ "فراغتے و کتابے" کا جہاں اتنا عمل دخل ہو تو آپ خود قیاس فرما سکتے ہیں کہ معلمی کا پیشہ چھڑوانے میں ہمیں کیسے کیسے سبز باغ دکھانے پڑے ہوں گے لیکن اس کار ثواب میں ہمیں زیادہ جھوٹ نہیں بولنا پڑا، اس لیے کہ علم و ادب سے بیزار کرنے میں علمائے جامعہ نے ایسا موثر کردار ادا کیا کہ پروفیسر کا دل اپنے کسب سے کھٹا ہو گیا۔ دوران رخصت خبر آئی کہ یونیورسٹی نے ان کے ایک جونیئر کو ۱۸۵۷ء میں دلی کے سودا بیچنے والوں کی آوازوں پر ریسرچ کرنے سات سمندر پار لندن بھیجا ہے۔ پروفیسر نے اسی وقت ہمارے بیٹے کی چار لائن والی کاپی پر استعفیٰ لکھ کر بیرنگ پوسٹ کر دیا اور اپنا ناتمام تھیسس "چاکسو (خورد)

کا دبستان شاعری" (جس کا موضوع ان شعراء کا کلام تھا' جن کی ولادت کہیں اور (ہونے کی بجائے چاکسو خورد میں ہو گئی تھی) پھاڑ کر پھینک دیا۔ اس تھیسس کے پندرہ سال تک ادھورے رہنے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ بعض ایسے شعراء جن پر وہ تبصرہ کرنا چاہتے تھے' ان کے انتقال میں ابھی خاصی دیر معلوم ہوتی تھی۔

تو یہ اس کا زمانے کا ذکر ہے جب پروفیسر اپنی بوسیدہ جلا ہی نہیں چکے تھے' بلکہ اس کی راکھ سے تن پر بھبوت رمائے مورکھوں کے من کی آنکھیں کھولتے پھرتے تھے۔

کلاس روم سے بنک تک پہنچنے میں پروفیسر کو کس صراط مستقیم سے گزرنا پڑا' یہ ان کا دل جانتا ہے یا ہم۔ سے اس کا ذکر نامناسب موقع کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔ بنک میں افسری سے ان کے کندھوں کا پروفیسرانہ خم تو دور نہ ہوا' مگر بہت سی اور خوشگوار تبدیلیاں' کچھ از خود کچھ اوروں کے کہنے سننے سے' ان کی شخصیت میں پیدا ہوتی چلی گئیں۔ اب تک ان کی شخصیت Self-Made (خود ساختہ) تھی یعنی اس میں انہوں نے درزی' دھوبی' ڈاکٹر اور نائی کو اصلاح کرنے کا کوئی موقع نہیں دیا تھا۔ پروفیسر کے ابتدائی ایام میں جب لڑکے بالکل لڑکوں ہی کی سی حرکتیں کرنے لگے تو ہم سب نے صلاح دی کہ لب و لہجہ میں ڈپٹ اور شخصیت میں رعب داب پیدا کرو۔ دوسرے ہی دن انہوں نے جوتوں میں پون انچ موٹا تلا لگوا لیا اور اونچی باڑھ کی ٹوپی پہننی شروع کر دی' جس سے قد تو خیر کیا بڑھتا' البتہ خودی اتنی بلند ہو گئی کہ ہم نے انہیں بادشاہی مسجد کے دروازے سے بھی جھک کر نکلتے دیکھا۔ رائی زور خودی سے پربت بن چکی تھی۔ کردار بھی ان کا اپنا نہیں رہا تھا۔ شاہین کی خصلت اختیار کر لی تھی۔ یعنی بار بار اپنے موضوع اور مخاطب پر "جھپٹنا' پلٹنا' پلٹ کا جھپٹنا"

جھوٹ کیوں بولیں' ہم نے کبھی شاہین نہیں دیکھا۔ اللہ جانے' اس کے مونچھیں ہوتی ہیں یا نہیں۔ بہرحال انہوں نے رکھ لی تھیں جو برابر تاؤ دیتے دیتے کاگ کھولنے کے اسکریو جیسے ہو گئی تھیں۔ دائیں مونچھ ہمیشہ سفید رہتی تھی۔ اس لیے کہ بلیک بورڈ پر سفید

چاک سے لکھتے لکھتے، اسی چٹکی سے بل دیتے رہتے تھے۔ اور یہ عادت اتنی راسخ ہو چکی تھی کہ حالانکہ بنک میں تقرر کا خط ملتے ہی مونچھ کا صفایا کر دیا، لیکن بے چین چٹکی سے مہینوں اس جگہ کو تاؤ دیتے رہے، جہاں کبھی مونچھ ہوا کرتی تھی۔ ان تبدیلیوں کا یہ اثر ہوا کہ لڑکوں نے ان کے لیکچر کی فاش غلطیوں پر ہنسنا چھوڑ دیا۔ اب ان کے حلئے پر ٹھٹھے لگاتے تھے۔

تقرر کے تین مہینے بعد بنک نے پروفیسر کو تعلقات عامہ اور ایڈورٹائزنگ کی تربیت کے چھ ہفتے کے کورس پر پیرس بھیجنے کے احکام صادر کئے۔ اور یہ بھی پیشکش کی کہ اگر آپ اپنی بیگم کو ہمراہ لے جائیں تو ہمیں عین مسرت ہو گی۔ دونوں کے فرسٹ کلاس ٹکٹ اور ہوٹل کے جملہ اخراجات بنک کے ذمہ ہوں گے۔ خط ملتے ہی دماغ میں شہنائیاں بجنے لگیں۔ کراچی کی ان تمام خواتین کی، جن کے جملہ حقوق ہنوز غیر محفوظ تھے، ایک مکمل فہرست ہم سے بنوائی اور پھر پسر گئے کہ سر دست ان میں سے کسی ایک سے دو بول پڑھوا دو تا کہ ٹکٹ بیکار نہ جائے اور ہنی مون مفت پڑے۔ اگر مرزا نے ایک ہی فقرے سے ان کے ذہن کی ساری گرہیں نہ کھول دی ہوتیں تو خدا جانے کب تک ہماری جان کو آئے رہتے۔ فرمایا، "بیوی کو پیرس ڈھو کر لے جانا ایسا ہی ہے جیسے کوئی ایورسٹ سر کرنے نکلے اور تھرماس میں گھر سے برف کی ڈلی رکھ کر لے جائے۔"

پیرس (جسے اب وہ پیار میں "پیری" کہتے تھے) سے لوٹنے کو تو لوٹ آئے لیکن دماغ وہاں کے قہوہ خانوں اور دل قحبہ خانوں میں چھوڑ آئے۔ جسد خاکی کو پاکستان میں گھسیٹے پھر رہے تھے۔ سامنے نادہندہ کے بہی کھاتے کھلے پڑے ہیں، مگر آنکھوں میں وہی کتابی چہرے پھر رہے ہیں۔

کہ دیکھیں جن کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ

ایک ایک سے پوچھتے تھے پاکستان میں انقلاب فرانس کب آئے گا؟ اس انقلاب کی پذیرائی کے لیے وہ اپنی پتلون کی

"کریز" استرے کی دھار جیسی بنائے رکھتے تھے۔ پرانی وضع کی غرارے نما پتلونوں کے پائنچے ان کی ہمشیرہ نے گاؤ تکیوں پر بطور غلاف چڑھا دیئے اور ان کی اونچی باڑ کی ٹوپی

سے ایک خوبصورت ٹی کوزی بنائی جسے اٹھاتے ہی ان کا سر یاد آتا تھا۔ پہلے اپنے والد ماجد کو بھی خط لکھتے تو آخر میں "تابعدار" پروفیسر قاضی عبدالقدوس ایم اے، بی ٹی، گولڈ میڈلسٹ لکھ کر، گولڈ میڈلسٹ کے نیچے احتیاطاً خط کھینچ دیا کرتے تھے کہ بندہ بشر ہے، مبادا نظر چوک جائے۔ لیکن اب کاغذ پہ کلیجہ نکال کے رکھ دینے کے بجائے بینکروں کے طرز پر دستخط کی جگہ ایک جلیبی سی بنا دیا کرتے تھے، جس کی نقل کم از کم کاغذ پر کوئی حلوائی بھی نہیں کر سکتا۔ کالر میں دھوبی سے خاص طور پر کلف لگواتے۔ خود بھی انگریزی تلفظ میں خوب کلف لگانے لگے تھے۔ دلدر دور ہوتے ہی وقت کی پابندی بھی تکلیف دہ حد تک کرنے لگے۔ جب سے اندھیرے میں وقت بتانے والی قیمتی گھڑی خرید کر لائے تھے، انہیں دن سے سخت الجھن ہونے لگی تھی۔ فرشی نشست کے بچپن سے عادی تھے۔ وہ ترک تو نہیں کی، لیکن اب گاؤ تکیے کا سہارا لے کر نہیں بیٹھتے تھے۔ اسے گود میں لے بیٹھتے تھے۔ مختصر یہ کہ "پرسنیلٹی" نکل آئی تھی۔ بیل گاڑی میں جیٹ لڑاکا ہوائی جہاز کا انجن لگ گیا تھا۔

مدیر سہ ماہی "نیا افق" جنھوں نے یہ عصرانہ ترتیب دیا تھا، شعر کا عجب مذاق رکھتے ہیں۔ شعر کو غلط پڑھ کر اور غلط سمجھ کر بھی اس قدر لطف اندوز ہوتے ہیں کہ اچھے اچھے صحیح سمجھنے والے بغلیں جھانکتے رہ جاتے ہیں۔ روزمرہ بات چیت میں بھی خود کو راقم الحروف کہتے ہیں۔ جیسے ہی ہم ٹاٹ کا پردہ اٹھا کر "نیا افق" کے دفتر میں داخل ہوئے، مدیر موصوف نے ہمارے سلام کے جواب میں دو تین دفعہ اپنا بگلے کی گردن کی طرح موڑ موڑ کر ہمیں دکھایا، جسے ہم نے بدتمیزی سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔ مگر جونہی ہمارا سر چھت سے ٹکرایا، ہماری سمجھ میں آ گیا کہ رنجور صاحب نے جو ہاتھ کا بگلا بنا کر ہمیں چڑایا تھا تو وہ دراصل سر گھٹنوں میں دے کر چلنے کا اشارہ تھا، کیونکہ دفتر کی چھت بمشکل

پانچ فٹ اونچی ہو گی۔ وہ تو خدا بھلا کرے مرزا کا' اگر وہ ہماری گرن میں لٹک کر ہمیں فی الفور دہرا نہ کر دیتے' تو ہمارا کاسہ سر اوپر چلتے ہوئے پنکھے سے کب کا بڑی صفائی سے ترش کر ان کے قدموں میں جا گرا ہوتا۔ اور ہم تو کیا' ہمارے بیمے کے رقم تک خرد برد ہو چکی ہوتی۔

سر اتارنے کے علاوہ پنکھے کا ضمنی مصرف بقول شخصے گرم ہوا کو سارے کمرے میں بحصہ مساوی پھیلانا تھا تا کہ کوئی حصہ محروم نہ رہ جائے' مدیر سہ ماہی "نیا افق" نے اپنا بایاں ہاتھ مصافحہ کے لیے پیش کیا۔ ہم نے بھی اخلاقاً اپنا بایاں نکالا تو چاروں طرف سے کھی کھی کی آوازیں آنے لگیں۔ ہم نے جھینپ کر جھٹ اسے دائیں جیب سے ٹھونسنے کی کوشش کی۔ پھر یاد نہیں' کون سی جیب میں سے اپنا دایاں کھینچ کر نکالا اور اسے ان کے بائیں سے ملوانے کی کوشش کی۔ کھی کھی کھی کھی کی آوازیں اور تیز ہو گئیں۔ تڑپ کر انھوں نے اپنا ہاتھ چھڑایا اور دونوں ہاتھوں سے ہماری دائیں کلائی مروڑ کے ہتھیلی کا رخ اپنی جانب کیا۔ پھر ہماری ہتھیلی کو اپنی ہتھیلی سے دو تین دفعہ خلوص سے رگڑا' جسے ہم ان حالات میں مصافحہ کہہ دیں تو مبالغہ نہ سمجھا جائے۔

دراصل بھول ہماری ہی تھی۔ اس لیے کہ ہر شخص جانتا تھا کہ رنجور صاحب دو سال سے بائیں ہاتھ سے مصافحہ کرنے لگے ہیں' جس کی وجہ یہ تھی کہ گزشتہ بارہ سال وہ بائیں ہاتھ میں ایک سوٹ کیس لٹکائے پھرتے تھے' جسے ازراہ انکسار بریف کیس کہتے تھے۔ اس میں بارہ سال کے سارے کرتوت یعنی تمام خاص نمبر اور بیگم کے ہاتھ کی بنائی ہوئی گلوریاں بند رہتی تھیں۔ دونوں میں ایک دوسرے کی بو باس اس طرح رچ بس گئی تھی کہ مشتہرین کو "طوائف نمبر" کھول کر دکھاتے تو محسوس ہوتا گویا پاندان کھل گیا اور کبھی ورق نقرہ میں لپٹی لکھنؤی قوام اور سستی خوشبوؤں کے بھبکے مارتی گلوری کھلا دیتے تو لگتا کہ "طوائف کی پاپ بیتی" بلکہ خود اسی کو چبا رہے ہیں۔ بریف کیس اٹھائے پھرنے سے ان کا بایاں کندھا مستقلاً جھک گیا تھا۔ اور اب یہ زنبیل ہاتھ میں

میں نہ ہو تب بھی ان کا بایاں ہاتھ گھٹنے کو چھوتا تھا۔ سے جب انہیں دنیائے ادب
میں Leaning Tower of Pisa کے لقب سے یاد کیا جانے لگا تو شروع شروع بہت
اتراتے پھرے۔ پھر ایک دن مرزا نے تخلیہ میں سمجھایا کہ اشارہ تمہارے سیاسی جھکاؤ
کی طرف نہیں ہے تو چونک پڑے۔ "اچھا! یہ بات ہے۔" کندھوں کی بارہ سال پرانی
کان نکالنے کے لیے مرزا نے یہ ورزش تجویز کی کہ آئندہ بارہ سال تک دوسرے ہاتھ
سے اٹھاؤ۔ چنانچہ انہوں نے بریف کیس دائیں ہاتھ میں منتقل کر دیا اور بائیں ہاتھ سے
مصافحہ کی عادت ڈالی۔ گلوری بھی اب بائیں کے بجائے دائیں کلے میں رکھنے لگے تھے۔
یہ اسی زمانے کا ذکر ہے۔

متذکرہ مصافحہ ہو چکا تو پروفیسر نے ہمارا تعارف کرایا کہ آپ سے ملئے۔ آپ ہمارے
ساتھ پانچویں جماعت میں دینیات کے پرچے میں نقل کرکے فیل ہوئے تھے۔ اس وقت
دو چھتی کے نیچے دس بارہ آدمی بیٹھے ہوں گے، حالانکہ کرسیاں دو ہی نظر آ رہی تھیں۔
ایک کی ٹانگ شرابی جیسی تھیں۔ اس پر میزبان یعنی مدیر "نیا افق" لڑکھڑا رہے تھے۔
دوسری کی پشت اور پایوں کا گھنا ہوا حصہ چھ چھ انچ کاٹ دیا گیا تھا۔ اس پیڑھی پر
مہمان خصوصی کنڈلی مارے بیٹھے تھے۔ ان کی ٹھوڑی میز پر اس طرح دھری تھی جیسے
میلوں اور قصباتی نمائشوں کے جادو گھر میں مداری کے جھمورے کا کٹا ہوا سر رکھا ہوتا
ہے۔ سامنے "نیا افق" کی ناقابل فروخت کاپیوں کے بنڈل دیوار کے ساتھ بڑے قرینے
سے چنے ہوئے تھے۔ ان پر رسالے کے قلمی معاونین بٹھائے گے تھے۔ یہ نہیں کہ میزبان
کو اپنے عزیز مہمانوں کی بے آرامی کا احساس نہ تھا۔ ہر آنے والے کی آؤ بھگت وہ
اس طرح کرتے کہ جھپاک سے اپنے نیچے سے روئی کی گدی نکال کر اسے پیش
کرتے۔ اور "جی آپ! نہیں آپ! ارے صاحب! کیوں کانٹوں میں گھسیٹے ہیں؟" کی پر
تکلف تکرار کے بعد اسے واپس اپنی کرسی پر ڈھک دیتے کہ موخر الذکر میں ایک سوراخ
تھا، جس میں سے دو فٹ بال بغیر رگڑ کھائے گزر سکتے تھے۔ دروازے کے بائیں جانب
تین زنگیائے کنستروں پر دفتر کا سائن بورڈ رکھ کر بجتا ہوا صوفہ بنا دیا گیا تھا۔ یہ نشست

نقادوں کے لیے مخصوص تھی۔ ہمیں ناقابل اشاعت فحش افسانوں کے ایک پلندے پر بٹھایا گیا' جن کی گرمی بھی ابھی ٹھیک سے نہیں نکلی تھی۔ ملحقہ کمرے سے ہر عمر کے بچوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ دفتر کی دیواریں دیکھ کر خیال ہوتا تھا کہ یہاں سلیٹ کا رواج نہیں ہے۔ کچھ دیر بعد انہی میں کا ایک بچہ ایلومینیم کا جگ لے کر آیا اور مشروب مشرق یعنی خالص پانی کا دور چلا۔ پانی واقعی نہایت شفاف تھا۔ اتنا شفاف کہ گلاس کا گندہ پیندا صاف نظر آ رہا تھا۔ ذرا دیر میں سب چھک گئے تو پان پیش کئے گئے' جنہیں اس دفعہ گلوری کہنے میں اس لیے تامل ہے کہ وہ اتنے ننھے منے تھے کہ چھالیا کے دانے ان میں سما نہیں سکتے تھے۔ لہٰذا چھالیا الگ سے پیش کی گئی۔ ہاں تمباکو وافر مقدار میں تھا۔ جس کا جتنا جی چاہے' کھا لے۔

ان تکلفات کے بعد جلسے کی کارروائی شروع ہوئی۔ چار نامور نقادوں نے پروفیسر قاضی عبدالقدوس ایم اے' بی ٹی' (گولڈ میڈلسٹ) کے مضمون "موازنہ ٹی ایس ایلیٹ و شیخ امام بخش ناسخ" پر مقالے پڑھے۔ یوں تو یہ مضمون پروفیسر موصوف نے پچیس سال پہلے اپنے زمانہ طالب علمی میں سپرد قلم کیا تھا' مگر نقادوں نے اس پر بالکل نئے زاویوں سے روشنی ڈالی تھی۔

اخیر میں مرزا عبدالودود بیگ نے خطبہ اختتامیہ پڑھ کر حق دوستی ادا کیا۔ انہوں نے "بینک آف چاکسو ادبی انعام" کی ایک انقلابی تجویز بھی پیش کی۔ تجویز یہ تھی کہ کچھ قلم کے دھنی ایسے ہیں جو اگر لکھنے سے باز آ جائیں تو اردو پر بڑا احسان ہو گا۔ بنک آف چاکسو پرائز انہی محسنوں کی خدمت میں پیش کیا جائے گا۔ اس بات کی پوری چھان بین کرنے کے بعد کہ کس مصنف نے سال بھر واقعی کچھ نہیں لکھا ہے' جج سالانہ پھسلا دے کا اعلان کریں گے۔ انعام یافتہ مصنف اگر پرورش لوح و قلم سے سیدھی طرح باز آ جائے تو "لائف پنشن" کا حقدار ہو گا جو بشرط نیک چلنی اسے ماہ بماہ ملتی رہے گی۔ اگر بر وقت موت واقع ہو جائے تو بیوہ کے لیے معقول وظیفہ بھی مقرر کیا جائے

گا' بشرطیکہ وہ تمام غیر مطبوعہ تخلیقات جو مرحوم چوری چھپے کرتے رہے' ان کے ساتھ ہی دفن کر دی جائیں۔

اس پر ہم نے زور زور سے تالیاں اور پاس والا کنستر بجایا۔ اور اللہ جانے' کب تک بجاتے رہے اگر مرزا یکایک یہ اعلان نہ کر دیتے کہ اس سلسلہ کے پہلے انعام کا مستحق سارے پاکستان میں ہم (یعنی راقم السطور) سے زیادہ اور کوئی نہیں۔

ہماری یہ درگت ہفتے میں چار پانچ دفعہ ضرور بنتی تھی۔ اس لیے کہ ہفتے میں چار پانچ دفعہ پروفیسر کے اعزاز میں کہیں نہ کہیں استقبالیہ ہوتا تھا' جہاں پہلی صف میں تالی بجاتے ہوئے فوٹو کھنچوانے کے فرائض ہمارے ذمے ہوتے تھے۔ (مرزا کہتے ہیں کہ بڑے آدمیوں کی تقریر کے بعد تمہاری تالی بالکل الگ سنائی دیتی ہے) دفتر میں اپنی مصروفیت کے بارے میں دن بھر باتیں کرکے پروفیسر خود کو بری طرح تھکا لیتے تھے۔ ایک عمر نیکی و ناکامی کی زندگی بسر کرنے کے بعد اب وہ جہاں نظر آتے' گوٹے کے ہار پہنے' افتتاحی فیتے کاٹتے نظر آتے۔ یہاں تک سننے میں آیا ہے کہ ان تمام ضیافتوں کا خرچ پروفیسر خود اٹھاتے ہیں۔ صرف ایک استقبالیہ کا بار انہوں نے نہیں اٹھایا۔ اس کا مفصل حال ہم آپ کو سنا چکے ہیں۔ سات آٹھ مہینے تک تو ان کے تقرر کی خوشی میں دعوتیں ہوتی رہیں۔

اور اس کے بعد غالباً اس خوشی میں کہ وہ ابھی تک برخاست نہیں ہوئے تھے۔ ہو یہ رہا تھا کہ سستے اور فلمی رسالے بنک کے اشتہار کی گھات میں رہتے اور موقع پاتے ہی (جو پروفیسر مستقل فراہم کرتے رہتے تھے) نپا تلا وار کر جاتے۔ یعنی پروفیسر کا "موازنہ ٹی ایس ایلیٹ و شیخ امام بخش ناسخ" جس میں انہوں نے مولے کو شہباز سے لڑایا تھا' من و عن چھاپ دیتے۔ پروفیسر غریب اب "موازنہ" کو جتنا دبانا اور چھپانا چاہتے' رسالے اتنا ہی اسے اچھالتے۔ گویا مصنف کو اسی کی تحریر سے بلیک میل کر رہے تھے۔ پروفیسر کو شہر کے ایک ایک بک اسٹال سے ایسے شماروں کی تمام کاپیاں بنک کے خرچ پر خرید کر جلانی پڑتیں تا کہ لوگ "موازنہ" نہ پڑھ پائیں۔ اب وہ اپنے گڑے مردے کو

اکھڑوا کر روح پھنکواتے عاجز آ چکے تھے۔ مجبوراً "موازنہ" کی جگہ بنک آف چاکسو کے بارہ اشتہار بک کرکے ایڈیٹر کے منہ پر ایک سال کے لیے طلائی قفل لگا دیتے۔

پروفیسر کو ان کے ماضی کے ملبے سے کھینچ کر نکالنے کا سہرا مرزا کے سر ہے۔ ان کی ذہنی آباد کاری میں جو دشواریاں پیش آئیں' ان کا احاطہ اس مختصر سے مضمون میں کرنا ہمارے بس کی بات نہیں۔ پروفیسر کو نیک و بد کی تمیز ضرور تھی۔ اور اگر قوت باصرہ فرانس کی شمپین سے متاثر نہ ہو تو سیاہ و سفید میں بھی امتیاز کر سکتے تھے بشرطیکہ ان رنگوں کا تعلق نسوانی جلد سے ہو۔ مگر چھوٹے بڑے بیوپاری کی پہچان؟ یہ سوال انہیں ہمیشہ نصاب سے باہر معلوم ہوتا تھا۔ کسی کا "بنک بیلنس" ماتھے پر لکھا ہوتا نہیں۔ چنانچہ ایک دو مہینے تک یہ رویہ رہا کہ اگر کوئی شخص میلا مسلا کرتا پاجامہ پہنے' خط بڑھائے انگوٹھے اور کلمے کی انگلی سے باچھوں کی پیک پونچھتا بغیر کارڈ بھیجے کمرے میں منہ اٹھائے چلا آتا تو اسے دھکے دے کر تو نہ نکالتا مگر اس طرح پیش آتے کہ اس زحمت کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ غلط اردو بولنے والوں کو چائے تک کے لیے نہ ٹوکتے لیکن جب پہلی ہی بورڈ میٹنگ میں انہی میں کے چار اشخاص کو ڈائریکٹروں کی سرخ مخملی کرسیوں پر متمکن دیکھا (جن سے اپنے کمرے میں انہوں نے ہاتھ بھی نہیں ملایا تھا تا کہ بعد میں رگڑ رگڑ کر نہ دھونا پڑے) تو ان کی آنکھیں کھل گئیں اور چار ہندسے والی تنخواہ خطرے میں نظر آنے لگی۔ پھر تو دل میں ایسا ہول بیٹھا کہ سڑک پر کوئی بھی میلے کچیلے کپڑوں میں نظر آ جاتا تو فوراً سلام کر لیتے تھے۔

پروفیسر کو بوکھلاہٹ سے ان کی عظیم ذمہ داریوں کا اندازہ ہوتا تھا۔ اور ان عظیم صلاحیتوں کا بھی جن کے بغیر وہ بخوبی گزارہ کر رہے تھے۔ حواس مختل' زبان کھچڑی' لب و لہجہ اکھڑا اکھڑا۔ اور بات بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ غور تو فرمایئے۔ ابھی تو ملتان کے سوداگر چرم و پشم کے ساتھ اس پر شرط بدی جا رہی ہے کہ حاجیوں کے پہلے جہاز کی واپسی پر تیزابی سونے کا بھاؤ کتنا گرے گا۔ اور اب Fanny Hill کے دوران خون کو تیز کرنے

والے اقتباسات میز کی دراز سے نکل کر سنائے جانے لگے۔ پانچ منٹ پہلے ایک اشتہار کے طلبگار سے ہاتھ پائی ہوتے ہوتے رہ گئی کہ اس نے منہ بھر کر یوں کہہ دیا تھا کہ آپ ہر پھر کے اندھوں ہی کو ریوڑی بانٹتے ہیں۔ اور اب یہ مسئلہ زیر بحث ہے کہ پانی کے دریاؤں سے (اس زمانے میں قراۃ العین حیدر کے ناول "آگ کا دریا" کا نام لوگوں کی زبان پر اس قدر چڑھا ہوا تھا کہ جب بھی اصلی دریا کا ذکر ہوتا تو پروفیسر موصوف ابہام سے بچنے کے لیے پانی کا دریا کہتے تھے) جو نقصان مشرقی پاکستان میں ہوا ہے' اس سے بنکوں کی شرح سود اور اردو رباعی پر کیا اثر پڑے گا۔ ایک ریسیور یہ کہہ کر رکھ دیا کہ "ذرا ایک منٹ توقف فرمایئے۔ میں ہانگ کانگ ڈالر کا بھاؤ ابھی معلوم کرکے بتاتا ہوں۔" دوسرے فن پر یکبارگی اپنا گیئر بدل کر کہنے لگے "واہ واہ! کیا پھڑکتا ہوا مصرع نکالا ہے' ذرا پانچ بعد دوسرا بھی مرحمت فرمایئے گا۔" مگر مصرع ثانی والی گھنٹی پانچ کی بجائے دو منٹ بعد ہی بجنے لگی۔ "ہیلو ہیلو! واللہ کیا تیور ہیں۔ بالکل مومن کا سا انداز ہے۔ ہائیں! کیا کہا؟ مومن ہی کا شعر ہے۔ لاحول ولا قوہ! میں تو سمجھا' آپ کا ہے۔ مگر مومن کی بھی کیا بات ہے۔ کبھی بھی ظالم آپ ہی کے انداز میں شعر کہہ جاتا ہے۔"

کاروباری دنیا م یں بالعموم شعر و شاعری کی گنجائش نہیں ہوتی۔ مگر پروفیسر نے نکال لی تھی۔ مہینوں تک یہ حال رہا کہ ہر دو جملوں کے بعد ایک شعر جھاڑ دیتے تھے۔ اور یہ جملے بھی دراصل شعر ہی کہ تمہید یا تعریف میں ہوتے تھے۔ ورنہ انہیں چھوٹ دے دی جاتی تو بنکاری کے پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلہ کا دو ٹوک فیصلہ دیوان حافظ سے نکال کے کر سکتے تھے۔ مرزا ایک دفعہ ان سے ملنے گئے تو کیا دیکھتے کہ فارمیکا کی ہلال نما میز کے گرد خوش گلو و خوش خوراک شعراء اشیائے خوردنی کے ساتھ انصاف فرما رہے ہیں۔ اور بنک میں دن دیہاڑے مشاعرہ لوٹ رہے ہیں۔ ٹیلیفون کا ریسیور اتار کر شاعر کے سامنے بنک میں دن دیہاڑے مشاعرہ لوٹ رہے ہیں۔ ٹیلیفون کا ریسیور اتار کر شاعر کے سامنے رکھ دیا گیا ہے تا کہ مشاعرے کی کارروائی صبغے تک "ریلے" کی جا سکے

جو چار میل دور صدر میں اپنی کتابوں کی دکان میں ڈیڑھ گھنٹے سے بائیں ہاتھ میں فون لیے بیٹھے ہیں، اور دائیں ہاتھ سے گاہکوں کو اس وقت کتابیں خریدنے سے منع کر رہے ہیں۔ شاعر کو کبھی کبھی ریسیور کان سے لگا کر صبغے کی داد سنوا دی جاتی ہے اور وہ اٹھ اٹھ کر لکھنؤ انداز سے فون کو آداب بجا لاتا ہے۔

مرزا غریب تو کسی کام سے گئے تھے لیکن دروازے کی درز میں سے جھانک کر یہ نقشہ دیکھا تو سرکاری کام کو ان کی تفریح میں حارج پا کر الٹے پاؤں لوٹ آئے۔ شعر و شاعری سے مرزا کی طبع ناموزوں یوں بھی ابا کرتی ہے۔ اور مشاعروں سے تو وہ کوسوں دور بھاگتے ہیں۔ خصوصاً بڑے مشاعروں سے۔ کہتے ہیں "صاحب! جو شعر بیک وقت پانچ چھ ہزار آدمیوں کی سمجھ میں آ جائے، وہ شعر ہو ہی نہیں سکتا۔ اس میں ضرور کچھ نہ کچھ کھوٹ نکلے گا۔ مرزا نے جب دیکھا کہ پروفیسر کو نثر میں اپنے خیالات کا اظہار کرنے میں بڑی دشواری ہونے لگی ہے تو سمجھانے بیٹھ گئے۔ "پروفیسر! یہ ساہو کار وہ سنسار ہے صحیح اردو سے گجراتی سیٹھ بے حد رعب کھاتا ہے، مگر سودا بگڑ جاتا ہے۔ کسی نے مجھے بتایا کہ دو سیٹھ مختلف اوقات میں تمہارے بنک میں اکاؤنٹ کھولنے آئے۔ لیکن ایک میمن کو تو تمہاری سیکرٹری نے گھسنے نہیں دیا۔ اور دوسرے چنیوٹی بیوپاری نے، جو رقم جمع کرانے آیا تھا، تمہیں بنک میں دیکھ کر فوراً ارادہ بدل دیا اور اپنی جمع جتھا ٹوپی میں چھپا کے کہنے لگا کہ میں تو دراصل اوور ڈرافٹ لینے آیا تھا۔ کمال یہ کہ تم نے واقعی اسے اوور ڈرافٹ دلوا دیا، جس سے اس نے اسی وقت دوسرے بنک میں جا کر اکاؤنٹ کھول دیا اور یوں اہل درد کو پنساریوں نے لوٹ لیا۔"

مرزا انہیں شعر سنانے سے باز رکھ سکتے تھے، لیکن شعر سننے پر کیسے پابندی لگائی جا سکتی تھی۔ پروفیسر سامنے بیٹھے ہوئے شاعر کا مصرع اٹھانے سے انکار کر سکتے تھے، لیکن ان کا منہ کیسے بند کرتے جو فرصت گفتگو غنیمت جان کر فون پر ہی خون تھوکنے لگتے تھے۔

ایک دن پروفیسر بری طرح بوکھلائے ہوئے تھے، کیونکہ آدھ گھنٹے بعد بورڈ آف ڈائریکٹرز

کا اجلاس تھا، جس میں بنک کا پبلٹی بجٹ برائے توثیق و گالی گلوچ پیش ہونے والا تھا۔
ان کی صورت ایسی ہو رہی تھی جیسی اشتہاروں میں ان لوگوں کی ہوتی ہے جن کو "بارلکس" کی ضرورت ہوتی ہے۔ میز پر کاغذات کا انبار لگا ہوا تھا۔ کمرے کے باہر لال بتی روشنی تھی، جس کا مطلب یہ تھا کہ آج وہ واہی تباہی آدمیوں یعنی اپنے خاص دوستوں سے ملاقات نہیں کریں گے۔
اتنے میں سفید ٹیلیفون کی بیٹھی بیٹھی آواز والی گھنٹی بجی اور دوسرے سرے سے گودام کیپر کی اسامی کے ایک امیدوار حضرت مدہوش مادھو پوری نے اپنے تخلص جیسے ترنم میں اپنی نو تصنیف مسدس سنانی شروع کی۔ ہر چند کہ یہ توڑ کا وقت تھا اور پروفیسر کو سگریٹ کی راکھ جھاڑنے تک کی فرصت نہ تھی، لیکن مسدس کے ابتدائی بند انہی کی مدح میں تھے۔ اور اللہ غنی، اس میں اس قدر غلو سے کام لیا گیا تھا کہ فون بند کرنے کو کسی طرح جی نہ چاہا۔ خدا جانے کب کا لیا دیا آڑے آ گیا کہ بیس منٹ بعد فون خود بخود خراب ہو گیا اور پروفیسر اپنی نیلی "بو" ٹھیک کرتے ہوئے بورڈ روم کی طرف بھاگے۔
اجلاس ایک بجے ختم ہو گیا مگر فون شام تک خراب رہا۔ پروفیسر نے قصداً اسے ٹھیک نہیں کرایا، اس لیے کہ وہ اپنی سیکرٹری کو یکسوئی کے ساتھ میٹنگ کی کارروائی لکھوانا چاہتے تھے۔ ٹیلیفون آپریٹر نے بھی فون ملانے بند کر دیے اور چند گھنٹے عافیت سے گزرے۔
وہ کارروائی لکھوا رہے تھے کہ یکایک سفید فون کی گھنٹی آپ ہی آپ بجنے لگی۔ وہ اچھل کر اپنی سیکرٹری کی گود میں جا پڑے اور دیر تک وہیں بے سدھ پڑے رہے۔
اسی عالم میں اس کے چٹکی لے کر دیکھا کہ جاگ رہا ہوں یا خواب میں ہوں۔ جب اس نے پٹاخ سے گالی دی تو انہیں یقین آیا کہ خواب نہیں ہے۔ ریسیور اٹھا کر بولے "ہیلو! کاضی عبدُل کدُس ہیئر، ہیلو ہیلو کاضی دس سائیڈ!" ادھر سے آواز آئی۔ "جی! بجا فرمایا، مگر میں مدہوش مادھو پوری عرض کر رہا ہوں۔ واللہ صبح دس بجے سے آپ کا فون درست کرانے میں لگا ہوا ہوں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے۔ دس جگہ شکایت نوٹ کرائی ہو گی۔ آخر جھک مار کر خود ٹیلیفون ایکسچینج گیا اور ایک ایک کی خبر لے ڈالی۔ جب

کہیں جا کر پانچ بجے آپ کی گھنٹی بجی ہے۔ جی! تو عرض کیا ہے....."
اور وہ چھ بجے تک عرض کرتے رہے۔
کوئی دن خالی جاتا ہو گا کہ خفت و آشفتہ خاطری کی کوئی نئی صورت پیدا نہ ہو۔ ایک دن (غالباً پیر کا دن تھا' جسے مرزا یوم سیاہ کہتے ہیں۔ اکثر پیش گوئی کرتے ہیں کہ دیکھ لینا' قیامت پیر ہی کے دن آئے گی) بنک میں اداس بیٹھے اپنے مخصوص انداز سے یعنی پیالی ہونٹوں سے لگاتے وقت چھنگلیا اٹھائے ہوئے' فرنچ کافی پی رہے تھے۔ حسب عادت زور سے آنکھیں سکیڑ رکھی تھی' حالانکہ اس وقت روئے تاباں کے گرد سگریٹ کے دھوئیں کا ہالہ نہیں تھا۔ کافی کے ہر گھونٹ کے بعد بائیں ہاتھ سے اس خیالی دھوئیں کو ہٹاتے جاتے تھے تا کہ مچ مچی آنکھوں میں نہ گھسنے پائے۔ اتنے میں رسالہ "مینا بازار" کی ایڈیٹر آ نکلیں۔ پروفیسر نے کہا کہ آپ پچیس سال سے بالکل ویسی کی ویسی ہی ہیں۔ بہت خوش ہوئیں۔ حالانکہ پروفیسر کا مطلب دراصل یہ تھا کہ جیسی بدصورت آپ پچیس سال پہلے تھیں' ویسی ہی اب بھی ہیں۔ محترمہ نے "مینا بازار" کا تازہ شمارہ پیش کیا۔ پروفیسر سر ورق پر کسی ایکٹرس کی بجائے اپنی تصویر دیکھ کر بھونچکے رہ گئے۔ سب سے تکلیف دہ بات یہ تھی کہ تصویر بالکل ان سے ملتی تھی' بہتر نہ تھی۔
"مینا بازار میں اشتہار نکلنا تھا کہ تمام زنانہ رسالوں نے یلغار کر دی اور پروفیسر سوچتے رہی رہ گئے۔ "کھاؤں کدھر کی چوٹ' بچاؤں کدھر کی چوٹ"
مدیر "آنچل" سے جو تاریخی مچیٹا ہوا' اس کے مکالمے پاک بوہیمین کافی ہاؤس کے بیروں تک کو ازبر ہیں۔ پروفیسر کو مدیر موصوف سے پہلی نظر میں نفرت ہو گئی۔ وہ تو خیریت گزری' ورنہ پروفیسر کا سینہ اگر ۳۴ انچ کے بجائے ۴۳ انچ ہوتا تو پہلی ہی ملاقات میں ان کا بھرکس بنا ڈالتے۔ یہ رسالہ ۳۵ سال سے انہی خواتین کی خدمت کئے جا رہا ہے جو اس وقت ۳۵ سال کی تھیں جب رسالے کا پہلا شمارہ نکلا تھا۔ قصہ کہانی کی اوٹ میں یہی شریف بیبیاں اپنی ہم عمر بیبیوں کو مزید شریف رہنے کی تلقین کرتی رہتی تھیں۔ رسالہ ایسے عریاں افسانوں سے یکسر پاک تھا جن سے ہر شخص بقدر بد ذوقی محظوظ ہو

سکے۔ جنسی کہانیوں کے بجائے رسالے میں کنواریوں بالیوں کو پلنگ کی کوری چادر پر کروشئے سے "خوش آمدید" کاڑھنے کی ترکیبیں سکھائی جاتی تھیں۔ ادبی مزاج اتنا بدل چکا تھا کہ جو شاعر ۲۵ برس پہلے دنیا کو مایا کا جال سمجھتے تھے' وہ اب اسے سرمایہ کا جال کہنے لگے تھے۔ لیکن "آنچل" کے لکھنے والے آج بھی عورتوں کو مستورات کہتے اور ماحول پر لاحول بھیجتے ہیں۔ نئی تراش کی چولی میں ان بزرگوں کو قرب قیامت کے آثار دکھلائی دیتے ہیں۔ حالانکہ ہمارے مرزا عبدالودود بیگ تو الٹی تمنا کرتے ہیں کہ صاحب! قرب قیامت کی سچ مچ یہی نشانیاں ہیں تو پھر جلدی سے سورج سوا نیزے پہ آ جائے کہ زندگانی کا کچھ بھروسہ نہیں۔ اور صاحب!

زندگانی گر رہی تو نوجوانی پھر کہاں

موصوف نے آتے ہی فرمائش کی کہ "موازنہ" کی ٹکر کی کوئی چیز "آنچل" کے لیے عطا ہو۔ پروفیسر نے انہیں مطلع کیا کہ عدیم الفرصتی کے سبب وہ گزشتہ پچیّس سال سے کچھ نہیں لکھ سکے۔ سلام روستائی کے بعد غرض خاص کا اظہار ہوا۔ اشتہار چاہیے۔ پروفیسر نے عذر کیا' سالانہ بجٹ ختم ہو چکا ہے۔ فرمایا "چلئے' کوئی مضائقہ نہیں' بنک کے رجسٹروں اور فارموں کا سالانہ آرڈر ہی آنچل پریس کو عنایت فرمایئے۔" پروفیسر نے جواب دیا "مگر سات لاکھ روپے کی اسٹیشنری آپ ایک ٹریڈل مشین پر دس برس میں بھی نہیں چھاپ سکیں گے۔" ارشاد ہوا "تو پھر بنک سے پچاس ہزار کا کلین اور ڈرافٹ ہی دلوا دیجئے۔"

پروفیسر کے صبر کا مختصر سا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ دفتری ضبط و احتیاط کو بالائے طاق رکھتے ہوئے فرمایا۔ "آپ کے مطالبوں کی ترتیب بالکل الٹی ہے۔ بخدا بالکل الٹی! چاہیے تو یہ تھا

کہ پہلے آپ پچاس ہزار قرض مانگتے۔ اس کے بعد اسٹیشنری کے آرڈر کی فرمائش کرتے۔ یہ بھی نہیں ملتا تو اشتہار مانگتے۔ پھر بھی میں انکار کرتا تو مضمون طلب کرتے۔ پھر میری ہمت نہیں ہوتی کہ انکار کرتا۔ شرما شرمی مضمون تو دے ہی دیتا۔"

بولے "ارے صاحب! یہی تو مجھے بھی اندیشہ تھا۔"

بچوں کے رسالے ہمیشہ سے نگاہ التفات سے محروم تھے۔ آخر یہ کفر اس طرح ٹوٹا کہ رسالہ "بازیچہ اطفال" نے ایک ضخیم "اشتہار نمبر" نکالنے کا اعلان کیا اور اس کے بعد یہ رسالہ بھی بنک کے اشتہارات سے نوازا جانے لگا۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ "اشتہار نمبر" پر ریجھ گئے یا اس کی مدیرہ آنسہ سمنتا فرزوق کی تیغ ابرو سے برضا و رغبت ڈھیر ہوئے۔ سفید شلوار' سفید قمیض' سفید دوپٹہ' سیدھی مانگ' ننگے ہاتھ' ننگے کان۔ ہمیں تو وہ کسی طرف سے ایسی نہیں لگتی تھیں کہ آدمی کے پانچوں حواس پر ڈاکہ ڈال سکیں یا پہلی ہی ملاقات میں پروفیسر کے قلعہ ایمان کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں۔ لیکن یاد رہے کہ پروفیسر کنوارے تھے' چالیس سال کے تھے۔ اور حالیہ مردم شماری میں اپنا شمار مردوں میں کروا چکے تھے۔ یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ ہمارے ہیرو نے آج تک کوئی عورت ایسی نہیں دیکھی' جس کو وہ ناپسند کر سکے۔ کنارے کو ترسا ہوا مانجھی ہر اتھلی کھاڑی میں لنگر ڈال دیتا ہے۔ آنسہ سمنتا نے آتے ہی مژدہ سنایا کہ انہوں نے "موازنہ" کو بچوں کے لیے آسان اردو میں منتقل کیا ہے۔ ہاں' عنوان میں تھوڑی سی تبدیلی کر دی ہے۔ یعنی شیخ امام بخش ناسخ کے بجائے مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کو بھڑا دیا ہے۔ البتہ اشعار وہی رہنے دیے ہیں تا کہ مضمون کی اصل شان برقرار رہے۔ اب موصوفہ اس مقالہ کے ساتھ مصنف سے انٹرویو کی روداد مع تازہ تصویر شائع کرنا چاہتی تھیں اور اس سلسلے میں پروفیسر کو اپنے ہاں سنیچر کو چائے پر مدعو کرنے آئی تھیں۔ پروفیسر نے بتیرا عذر کیا کہ سنیچر کی شام کو مجھے بہت کام ہے۔ تین کاک ٹیل پارٹیوں میں یکے بعد دیگرے شرکت کرنی ہے۔ لیکن وہ نہ مانیں۔ پیہم انکار سے ان کی آنکھوں

میں آنسو تیرنے لگے۔
پروفیسر کو عورت کے آنسوؤں کی ذرا سہار نہیں' بلکہ سچ تو یہ ہے کہ عورت کی کسی چیز کی سہار نہیں۔ چنانچہ طے یہ پایا کہ پروفیسر تین کاک ٹیل پارٹیاں لشتم پشتم بھگتا کر ساڑھے سات بجے تک ان کے گھر پہنچ جائیں گے۔

پروفیسر کا اپنا بیان تھا کہ انھوں نے تینوں کاک ٹیل پارٹیوں میں اپنے "پروٹوکول" فرائض کی انجام دہی میں "اپنی طرف سے تو کوتاہی میں کوئی کمی نہیں کی۔" مرزا کے کندھے پر اپنا سارا بوجھ ڈالے' وہ جم خانہ سے خم خانہ بکف و جم خانہ بدوش آنسہ سمنتا کے ہاں چائے نوش فرمانے پہنچے تو دس کا عمل ہو گا۔ جس وقت وہ اپنی تیس ہاتھ لمبی کیڈلک سے اترے ہیں تو مرزا کے بیان کے مطابق ان کا دایاں پاؤں اس جگہ پڑ رہا تھا جہاں بایاں پڑنا چاہیے تھا۔ اور جن حروف کی آوازیں ہما شما کے منہ سے نکلتی ہیں' وہ ان کی ناک سے باآسانی نکل رہی تھیں۔ گیلری سے گزرتے وقت انھوں نے ایک گرتی ہوئی دیوار کو اپنی پیٹھ سے سہارا دینے کی کوشش بھی کی۔ پھر انٹرویو شروع ہوا اور ٹیپ ریکارڈر چلنے لگا۔
مس سمنتا نے چند رسمی سوالات کے بعد پوچھا کہ آپ ابھی تک کنوارے ہیں۔ کس قسم کی بیوی اپنے لیے پسند کریں گے؟ پروفیسر نے جھومتے ہوئے فرمایا کہ مجھے روشن خیال بیوی بہت پسند ہے۔ بشرطیکہ وہ کسی دوسرے کی ہو۔ موصوفہ نے پلو منہ میں ٹھونستے ہوئے سن پیدائش پوچھا تو پروفیسر نے ۱۹۲۴ بتایا اور وضاحتۃ A.D. (بعد مسیح) بھی کہا تا کہ سننے والے کو مغالطہ نہ ہو۔ موصوفہ نے چندرا کر کہا' مگر آپ تو شکل سے صرف چالیس سال کے لگتے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ پروفیسر نے جواب دیا کہ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ میں چالیس ہی سال کا ہوں۔ پھر دوسری وجہ کی تشریح و تشہیر کرتے ہوئے فرمایا کہ ناول نگار جارج مور سے کسی صحافی نے دریافت کیا کہ آپ اسی سال کی عمر میں بھی سرخ و سپید رکھے ہیں' اس کا کیا راز ہے؟ اس نے جواب دیا کہ

میں نے شراب، سگریٹ اور سیکس کو قطعی طور پر ہاتھ نہیں لگایا۔ تاوقتیکہ میں گیارہ سال کا نہ ہو گیا۔

ہمارے یکطرفہ بیان سے یہ نہ سمجھا جائے کہ پروفیسر ترنگ میں اپنی ہی خوبیاں ذہن نشین کراتے رہے۔ ان کی نظر دوسروں پر بھی تھی۔ مثلاً انہوں نے موصوفہ کی توجہ ایک ایسی خوبی کی طرف مبذول کرائی، جس سے وہ بالکل بے خبر معلوم ہوتی تھیں۔ "آپ کی پسند" کا سوال آیا تو پروفیسر نے موتیا، مصحفی، سنیچر کی شام، ہنری ملر، مہاوٹ، دال بھرے گرم پراٹھے، ریشمی دولائی، نیگرو دوشیزہ .... کا ذکر کرتے کرتے "بھئی آپ کا دایاں کھانا سچ سچ بہت خوبصورت ہے" ایسے سوکھے منہ سے کہا کہ موصوفہ کے بائیں کان کو یقین نہ آیا کہ ان کا دایاں کان کیا سن گیا۔ سے مرزا کہتے ہیں کہ سمنتا فرزوق کے دونوں کے دونوں کانوں میں بظاہر کوئی فرق نہیں تھا، لیکن پروفیسر نے دائیں کی تخصیص غالبًا ازراہ احتیاط کی تھی، اس لیے کہ اس وقت انہیں صرف دایاں کان ہی نظر آ رہا تھا۔ بہرحال یہ جملہ بھی ریکارڈ ہو گیا اور اس کے ساتھ وہ ہچکیاں بھی جو ہر لفظ کے بعد ان کی سوانح خمری میں "فل اسٹاپ" لگا رہی تھیں۔ پروفیسر نے جب تیسری دفعہ یہ کلمات تحسین ممدوحہ کے کان میں انڈیلے تو انہوں نے ٹیپ ریکارڈر آہستہ سے "سوئچ آف" کر دیا۔ اور سفید دوپٹہ اپنے سر پر اس طرح لپیٹ لیا جیسے پرہیز گار بی بییاں نماز پڑھتے وقت لپیٹ لیتی ہیں۔ جیسے ہی وہ چائے لینے اندر گئیں تو مرزا کے گلے میں ہاتھ ڈال کر کہنے لگے۔ "ان کا دایاں واقعی بہت خوبصورت ہے۔"

بیچ میں مرزا نے دو تین دفعہ آنکھوں ہی آنکھوں میں اٹھنے کا اشارہ کیا تو پروفیسر نے اس طرح ہاتھ گھمایا جیسے چکی پیس رہے ہوں۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ وہیں مرزا کا لتو بنا دیں گے۔

وہ میز پر ٹرے رکھنے کے لیے جھکیں تو دوپٹہ ڈھلکے کر گلے میں آ گیا اور پروفیسر نے چپکے سے دائیں کان میں وہی جملہ دہرا دیا۔ اب کی دفعہ جو موصوفہ نے ڈھاٹا باندھا تو

آخر تک نہیں کھولا۔ خدا خدا کرکے پونے بارہ بجے انٹرویو اپنے اختتام کو اس طرح پہنچا کہ پروفیسر کو بیچ جملے کے نیند آ گئی۔ مرزا نے منہ پر پانی کے چھپکے دے کر جگایا۔ موصوفہ

چند منٹ بعد موصوفہ کو کار میں سوار کرانے باہر تشریف لائیں۔ وقت رخصت آداب بجا لانے کے لیے انھوں نے اپنی صراحی دار گردن خم کی تو دوپٹہ کا اینڈوا پھر سینے پر آ رہا اور پروفیسر نے جواب میں انگشت شہادت اٹھاتے ہوئے فرمایا۔ "آداب! اور بالیاں بھی....."

اور وہ جھینپ کر دائیں بائیں کانوں پر ہاتھ رکھے اندر بھاگ گئیں۔

صبح مرزا نے پروفیسر کو ان کے اقوال و افعال شبینہ سے آگاہی بخشی تو انھیں یقین نہیں آیا کہ ایسی نالائقی کا صدور ان کی ذات سے ہو سکتا ہے۔ اسی وقت جا کر اس نیک بی بی سے معافی مانگنے پر بضد تھے۔ مرزا نے بمشکل تمام باز رکھا۔ اس رات انھیں مارے ندامت کے نیند نہیں آئی۔ نیند تو دوسری رات بھی نہیں آئی، مگر کسی اور وجہ سے۔ وہ وجہ یہ تھی کہ موصوفہ خود بنک میں تشریف لائیں اور کہنے لگیں کہ ایک پرزے کی خرابی کی وجہ سے اس رات انٹرویو ٹھیک سے ریکارڈ نہیں ہوا۔ لہٰذا دوبارہ چائے پر زحمت فرمائیں۔

اور ہاں! آج وہ (دونوں) کانوں میں موتیا کی کلیوں کی بالیاں پہنے ہوئے تھیں۔ کان کی لو نہ جانے کتنی بار گلابی ہوئی ہو گی کہ جب وہ رخصت ہوئیں تو ایک کلی کھل چکی تھی۔

○○○

• ہوئے مر کے ہم جو رسوا

اب تو معمول سا بن گیا ہے کہ کہیں تعزیت یا تجہیز و تکفین میں شریک ہونا پڑے تو مرزا کو ضرور ساتھ لے لیتا ہوں۔ ایسے موقعوں پر ہر شخص اظہار ہمدردی کے طور پر کچھ نہ کچھ ضرور کہتا ہے۔ قطعہ تاریخ وفات ہی سہی۔ مگر مجھے نہ جانے کیوں چپ لگ جاتی ہے' جس سے بعض اوقات نہ صرف پسماندگان کو بلکہ خود مجھے بھی بڑا دکھ ہوتا ہے۔ لیکن مرزا نے چپ ہونا سیکھا ہی نہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ صحیح بات کو غلط موقع پر بے دغدغہ کہنے کی جو خدا داد صلاحیت انہیں ودیعت ہوئی ہے وہ کچھ ایسی ہی تقریبوں میں گل کھلاتی ہے۔ وہ گھپ اندھیرے میں سر رہگذر چراغ نہیں جلاتے' پھلجڑی چھوڑتے ہیں' جس سے بس ان کا اپنا چہرہ رات کے سیاہ فریم میں جگ مگ کرنے لگتا ہے۔ اور پھلجڑی کا لفظ تو یونہی مروت میں قلم سے نکل گیا' ورنہ ہوتا یہ ہے کہ "جس جگہ بیٹھ گئے آگ لگا کر اٹھے"

اس کے باوصف' وہ خدا کے ان حاضر و ناضر بندوں میں سے ہیں جو محلے کی ہر چھوٹی بڑی تقریب میں' شادی ہو یا غمی' موجود ہوتے ہیں۔ بالخصوص دعوتوں میں سب سے پہلے پہنچتے اور سب کے بعد اٹھتے ہیں۔ اس انداز نشست و برخاست میں ایک کھلا فائدہ یہ دیکھا کہ وہ باری باری سب کی غیبت کر ڈالتے ہیں۔ ان کی کوئی نہیں کر پاتا۔

چنانچہ اس سنیچر کی شام کو بھی میوہ شاہ قبرستان میں وہ میرے ساتھ تھے۔ سورج اس شہر خموشاں کو جسے ہزاروں بندگان کدا نے مر مر کے بسایا تھا' لال انگارہ سی آنکھ سے دیکھتا دیکھتا انگریزوں کے اقبال کی طرح غروب ہو رہا تھا۔ سامنے بیری کے درخت کے نیچے ایک ڈھانچہ قبر بدر پڑا تھا۔ چاروں طرف موت کی عمل داری تھی اور سارا قبرستان ایسا اداس اور اجاڑ تھا جیسے کسی بڑے شہر کا بازار اتوار کو۔ سبھی رنجیدہ تھے۔ (بقول مرزا' دفن کے وقت میت کے سوا سب رنجیدہ ہوتے ہیں) مگر مرزا سب سے الگ تھلگ ایک

پرانے کتبے پر نظریں گاڑے مسکرا رہے تھے۔ چند لمحوں بعد میرے پاس آئے اور میری پسلیوں میں اپنی کہنی سے آنکس لگاتے ہوئے اس کتبے تک لے گئے، جس پر منجملہ تاریخ پیدائش و پنشن، مولد و مسکن، ولدیت و عہدہ (اعزازی مجسٹریٹ درجہ سوم) آسودۂ لحد کی تمام ڈگریاں مع ڈویژن اور یونیورسٹی کے نام کے کندہ تھیں اور آخر میں، نہایت جلی حروف میں، منہ پھیر کر جانے والے کو بذریعہ قطعہ بشارت دی گئی تھی کہ اللہ نے چاہا تو بہت جلد اس کا بھی یہی حشر ہونے والا ہے۔ میں نے مرزا سے کہا "یہ لوح مزار ہے یا ملازمت کی درخواست؟ بھلا ڈگریاں، عہد اور ولدیت وغیرہ لکھنے کا کیا تک تھا؟"

انہوں نے حسب عادت بس ایک لفظ پکڑ لیا۔ کہنے لگے "ٹھیک کہتے ہو جس طرح آج کل کسی کی عمر یا تنخواہ دریافت کرنا بری بات سمجھی جاتی ہے اسی طرح بالکل اسی طرح بیس سال بعد کسی کی ولدیت پوچھنا بد اخلاقی سمجھی جائے گی۔"

اب مجھے مرزا کی چونچال طبیعت سے خطرہ محسوس ہونے لگا۔ لہٰذا انہیں ولدیت کے مستقبل پر مسکراتا چھوڑ کر میں آٹھ دس قبر دور ایک ٹکڑی میں شامل ہو گیا۔ جہاں ایک صاحب جنت مکانی کے حالات زندگی مزے لے لے کر بیان کر رہے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ خدا غریق رحمت کرے، مرحوم نے اتنی لمبی عمر پائی کہ ان کے قریبی اعزہ دس پندرہ سال سے ان کی انشورنس پالیسی کی امید میں جی رہے ہیں۔ ان امیدواروں میں سے بیشتر کو مرحوم خود اپنے ہاتھ سے مٹی دے چکے تھے۔ بقیہ کو یقین ہو گیا تھا کہ مرحوم نے آب حیات نہ صرف چکھا ہے بلکہ ڈگڈگا کے پی چکے ہیں۔ راوی نے تو یہاں تک بیان کیا کہ ازبسکہ مرحوم شروع سے رکھ رکھاؤ کے حد درجہ قائل تھے، لہٰذا آخر تک اس صحت بخش عقیدے پر قائم رہے کہ چھوٹوں کو تعظیماً پہلے مرنا چاہیے۔ البتہ ادھر چند برسوں سے ان کو فلک کج رفتار سے یہ شکایت ہو چلی تھی کہ افسوس اب کوئی دشمن ایسا باقی نہیں رہا جسے وہ مرنے کی بددعا دے سکیں۔

ان سے کٹ کر میں ایک دوسری ٹولی میں جا ملا۔ یہاں مرحوم کے ایک شناسا اور میرے

پڑوسی ان کے گیلڑ لڑکے کو صبر جمیل کی تلقین اور گول مول الفاظ میں نعم البدل کی دعا دیتے ہوئے فرما رہے تھے کہ برخوردار! یہ مرحوم کے مرنے کے دن نہیں تھے۔ حالانکہ پانچ منٹ پہلے یہی صاحب! جی ہاں' یہی صاحب مجھ سے کہہ رہے تھے کہ مرحوم نے پانچ سال قبل دونوں بیویوں کو اپنے تیسرے سہرے کی بہاریں دکھائی تھیں اور یہ ان کے مرنے کے نہیں' ڈوب مرنے کے دن تھے۔ سے مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ انہوں نے انگلیوں پر حساب لگا کر کانا پھوسی کے انداز میں یہ تک بتایا کہ تیسری بیوی کی عمر مرحوم کی پنشن کے برابر ہے۔ مگر ہے بالکل سیدھی اور بے زبان۔ مگر مرحوم اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ انہوں نے محض اپنی دعاؤں کے زور سے موصوفہ کا چال چلن قابو میں کر رکھا ہے۔ البتہ بیاہتا بیوی سے ان کی کبھی نہیں بنی۔ بھری جوانی میں میاں بیوی ۶۲ کے ہندسے کی طرح ایک دوسرے سے منہ پھیرے رہے اور جب تک جیئے ایک دوسرے کے اعصاب پر سوار رہے۔ ممدوحہ نے مشہور کر رکھا تھا کہ (خدا ان کی روح کو نہ شرمائے) مرحوم شروع سے ہی ایسے ظالم تھے کہ ولیمے کا کھانا بھی مجھ نئی نویلی دلہن سے پکوایا۔

میں نے گفتگو کا رخ موڑنے کی خاطر گنجان قبرستان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ دیکھتے ہی دیکھتے چپہ چپہ آباد ہو گیا۔ مرزا حسب معمول پھر بیچ میں کود پڑے۔ کہنے لگے' دیکھ لینا! وہ دن دور نہیں جب کراچی میں مردے کو کھڑا گاڑنا پڑے گا اور نائیلون کے ریڈی میڈ کفن میں اوپر زپ لگے گی تا کہ منہ دیکھنے دکھانے میں آسانی رہے۔

میری طبیعت ان باتوں سے دبنے لگی تو ایک دوسرے غول میں چلا گیا۔ جہاں دو نوجوان ستار کے غلاف جیسی پتلونیں چڑھائے چہک رہے تھے۔ پہلے "ٹیڈی بوائے" کی پیلی قمیض پر لڑکیوں کی ایسی واہیات تصویریں بنی ہوئی تھیں کہ نظر پڑتے ہی ثقہ آدمی لاحول پڑھنے لگتے تھے اور ہم نے دیکھا کہ ہر ثقہ آدمی بار بار لاحول پڑھ رہا ہے۔ دوسرے نوجوان کو مرحوم کی بے وقت موت سے واقعی دلی صدمہ پہنچا تھا' کیونکہ اس کا سارا "ویک

اینڈ" چوپٹ ہو گیا تھا۔

چونچوں اور چہلوں کا یہ سلسلہ شاید کچھ دیر اور جاری رہتا کہ اتنے میں ایک صاحب نے ہمت کرکے مرحوم کے حق میں پہلا کلمہ خیر کہا اور میری جان میں جان آئی۔ انہوں نے صحیح فرمایا "یوں آنکھ بند ہونے کے بعد لوگ کیڑے نکالنے لگیں' یہ اور بات ہے مگر خدا ان کی قبر کو عنبریں کرے' مرحوم بلا شبہ صاف دل' نیک نیت انسان تھے اور نیک نام بھی۔ یہ بڑی بات ہے۔"

"نیک نامی میں کیا کلام ہے۔ مرحوم اگر یونہی منہ ہاتھ دھونے بیٹھ جاتے تو سب یہی سمجھتے کہ وضو کر رہے ہیں۔" جملہ ختم ہونے سے پہلے مداح کی چمکتی چندیا یکایک ایک دھنسی ہوئی قبر میں غروب ہو گئی۔

اس مقام پر ایک تیسرے صاحب نے (جن سے میں واقف نہیں) "روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ" والے لہجے میں نیک نیتی اور صاف دلی کا تجزیہ کرتے ہوئے فرمایا کہ بعض لوگ اپنی پیدائش بزدلی کے سبب تمام عمر گناہوں سے بچے رہتے ہیں۔ اس کے برعکس بعضوں کے دل و دماغ واقعی آئینے کی طرح صاف ہوتے ہیں۔ یعنی نیک خیال آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں۔

شامت اعمال کہ میرے منہ سے نکل گیا۔ "نیت کا حال صرف خدا پر روشن ہے مگر اپنی جگہ یہی کیا کم ہے کہ مرحوم سب کے دکھ سکھ میں شریک اور ادنیٰ اور ادنیٰ سے ادنیٰ پڑوسی سے بھی جھک کر ملتے تھے۔"

ارے صاحب! یہ سنتے ہی وہ صاحب تو لال بھبوکا ہو گئے۔ بولے "حضرت! مجھے خدائی کا دعویٰ تو نہیں' تاہم اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اکثر بوڑھے خرانٹ اپنے پڑوسیوں سے محض اس خیال سے جھک کر ملتے ہیں کہ اگر وہ خفا ہو گئے تو کندھا کون دے گا۔"

خوش قسمتی سے ایک خدا ترس نے میری حمایت کی۔ میرا مطلب ہے مرحوم کی حمایت کی۔ انہوں نے کہا کہ مرحوم نے ماشاء اللہ اتنی لمبی عمر پائی۔ مگر صورت پر ذرا نہیں برستی تھی۔ چنانچہ سوائے کنپٹیوں کے اور بال سفید نہیں ہوئے۔ چاہتے تو خضاب لگا کے

خوردوں میں شامل ہو سکتے تھے مگر طبیعت ایسی قلندرانہ نہ پائی تھی کہ خضاب کا کبھی جھوٹوں بھی خیال نہیں آیا۔

وہ صاحب بیچ بیچ پھٹ پڑے "آپ کو خبر بھی ہے؟ مرحوم کا سارا سر پہلے نکاح کے بعد ہی سفید گالا ہو گیا تھا۔ مگر کنپٹیوں کو وہ قصداً سفید رہنے دیتے تھے تا کہ کسی کو شبہ نہ گزرے کہ خصاب لگاتے ہیں۔ سلور گرے قلمیں' یہ تو ان کے میک اپ میں ایک نیچرل ٹچ تھا۔"

"ارے صاحب! اسی مصلحت سے انہوں نے اپنا ایک مصنوعی دانت بھی توڑ رکھا تھا۔" ایک دوسرے بد گو نے تابوت میں آخری کیل ٹھونکی۔

"کچھ بھی سہی وہ ان کھوسٹوں سے ہزار درجے بہتر تھے جو اپنے پوپلے منہ اور سفید بالوں کی داد چھوٹوں سے یوں طلب کرتے ہیں' گویا یہ ان کی ذاتی جدوجہد کا ثمرہ ہے۔" مرزا نے بگڑی بات بنائی۔

ان سے پیچھا چھڑا کر کچی پکی قبریں پھاندتا میں منشی ثناء اللہ کے پاس جا پہنچا' جو ایک کتبے سے ٹیک لگائے' بیری کے ہرے ہرے پتے کچر کچر چبا رہے تھے اور اس امر پر بار بار اپنی حیرانی کا اظہار فرما رہے تھے کہ ابھی پرسوں تک تو مرحوم باتیں کر رہے تھے۔ گویا ان کے اپنے آداب جانکنی کی رو سے مرحوم کو مرنے سے تین چار سال پہلے چپ ہو جانا چاہیے تھا۔

بھلا مرزا ایسا موقع کہاں خالی جانے دیتے تھے۔ مجھے مخاطب کرکے کہنے لگے' یاد رکھو' مرد کی آنکھ اور عورت کی زبان کا دم سب سے آخر میں نکلتا ہے۔

یوں تو مرزا کے بیان کے مطابق مرحوم کی بیوائیں بھی ایک دوسرے کی چھاتی پر دوہتڑ مار مار کر بین کر رہی تھیں' لیکن مرحوم کے بڑے نواسے نے جو پانچ سال سے بیروزگار تھا' چیخ چیخ کر اپنا گلا بٹھا لیا تھا۔ منشی جی بیری کے پتوں کا رس چوس چوس کر جتنا اسے سمجھاتے پچکارتے' اتنا ہی وہ مرحوم کی پنشن کو یاد کرکے دھاڑیں مار مار کر روتا۔

اسے اگر ایک طرف حضرت عزرائیل سے گلہ تھا کہ انہوں نے تیس تاریخ تک انتظار کیوں نہ کیا تو دوسری طرف خود مرحوم سے بھی سخت شکوہ تھا۔ "کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور"

ادھر منشی جی کا سارا زور اس فلسفے پر تھا کہ برخوردار! یہ سب نظر کا دھوکہ ہے۔ درحقیقت زندگی اور موت میں کوئی فرق نہیں' کم از کم ایشیا میں۔ نیز مرحوم بڑے نصیبہ ور نکلے کہ دنیا کے بکھیڑوں سے اتنی جلدی آزاد ہو گئے۔ مگر تم ہو کہ ناحق اپنی جوان جان کو ہلکان کئے جا رہے ہو۔ یونانی مثل ہے کہ "وہی مرتا ہے جو محبوب خدا ہوتا ہے"

حاضرین ابھی دل ہی دل میں حسد سے جلے جا رہے تھے کہ ہائے' مرحوم کی آئی ہمیں کیوں نہ آ گئی کہ دم بھر کو بادل کے ایک فالسئی ٹکڑے نے سورج کو ڈھک لیا اور ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی۔ منشی جی نے یکبارگی بیری کے پتوں کا پھوک نگلتے ہوئے اس کو مرحوم کے بہشتی ہونے کا غیبی شگون قرار دیا۔ لیکن مرزا نے بھرے مجمع میں سر ہلا ہلا کر اس پیشگوئی سے اختلاف کیا۔ میں نے الگ لے جا کر وجہ پوچھی تو ارشاد ہوا۔

"مرنے کے لیے سنیچر کا دن بہت منحوس ہوتا ہے۔"

لیکن سب سے زیادہ پتلا حال مرحوم کے ایک دوست کا تھا' جن کے آنسو کسی طرح تھمنے کا نام نہیں لیتے تھے کہ انہیں مرحوم سے دیرینہ ربط و رفاقت کا دعویٰ تھا۔ اس روحانی یکجہتی کے ثبوت میں اکثر اس واقعے کا ذکر کرتے کہ بغدادی قاعدہ ختم ہونے سے ایک دن پہلے ہم دونوں نے ایک ساتھ سگریٹ پینا سیکھا۔ چنانچہ اس وقت بھی صاحب موصوف کے بین سے صاف ٹپکتا تھا کہ مرحوم کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت داغ بلکہ دغا دے گئے اور بغیر کہے سنے پیچھا چھڑا کے چپ چپاتے جنت الفردوس کر روانہ ہو گئے' اکیلے ہی اکیلے۔

بعد میں مرزا نے صراحتہً بتایا کہ باہمی اخلاص و یگانگت کا یہ عالم تھا کہ مرحوم نے اپنی موت سے تین ماہ پیشتر موصوف سے دس ہزار روپے سکہ رائج الوقت بطور قرض

حسنہ لیے اور وہ تو کہئے' بڑی خیریت ہوئی کہ اسی رقم سے تیسری بیوی کا مہر معجل بیباق کر گے ورنہ قیامت میں اپنے ساس سسر کو کیا منہ دکھاتے۔

آپ نے اکثر دیکھا ہو گا کہ گنجان محلوں میں مختلف بلکہ متضاد تقریبیں ایک دوسرے میں بڑی خوبی سے ضم ہو جاتی ہیں۔ گویا دونوں وقت مل رہے ہوں۔ چنانچہ اکثر حضرات دعوت ولیمہ میں ہاتھ دھوتے وقت چہلم کی بریانی کی ڈکار لیتے' یا سوئم میں شبینہ فتوحات کی لذیذ داستان سناتے پکڑے جاتے ہیں۔ لذت ہمسائیگی کا یہ نقشہ بھی اکثر دیکھنے میں آیا کہ ایک کوارٹر میں ہنی مون منایا جا رہا ہے تو رت جگا دیوار کے اس طرف ہو رہا ہے۔ اور یوں بھی ہوتا ہے کہ دائیں طرف گھر میں آدھی رات کو قوال بلیاں لڑا رہے ہیں' تو حال بائیں طرف والے گھر میں آ رہا ہے۔ آمدنی ہمسائے کی بڑھتی ہے تو اس خوشی میں ناجائز خرچ ہمارے گھر کا بڑھتا ہے اور یہ سانحہ بھی بارہا گزرا کہ مچھلی طرح دار پڑوسن نے پکائی اور "مدتوں اپنے بدن سے تیری خوشبو آئی"

اس تقریبی گھپلے کا صحیح اندازہ مجھے دوسرے دن ہوا جب ایک شادی کی تقریب میں تمام وقت مرحوم کی وفات حسرت آیات کے تذکرے ہوتے رہے۔ ایک بزرگ نے کہ صورت سے خود پا بہ رکاب معلوم ہوتے تھے' تشویش ناک لہجے میں پوچھا' آخر ہوا کیا؟ جواب میں مرحوم کے ایک ہم جماعت نے اشاروں کنایوں میں بتایا جوانی میں اشتہاری امراض کا شکار ہو گئے۔ ادھیڑ عمر میں جنسی تونس میں مبتلا رہے۔ لیکن آخری ایام میں تقویٰ ہو گیا تھا۔

"پھر بھی آخر ہوا کیا؟" پا بہ رکاب مرد بزرگ نے اپنا سوال دہرایا۔

"بھلے چنگے تھے' اچانک ایک ہچکی آئی اور جاں بحق ہو گئے۔" دوسرے بزرگ نے انگوٹھے سے ایک فرضی آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا۔

"سنا ہے چالیس برس سے مرض الموت میں مبتلا تھے۔" ایک صاحب نے سوکھے سے منہ سے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"چالیس برس سے کھانسی میں مبتلا تھے اور آخر اسی میں انتقال فرمایا۔"

"صاحب! جنتی تھے کہ کسی اجنبی مرض میں نہیں مرے۔ ورنہ اب تو میڈیکل سائنس کی ترقی کا یہ حال ہے کہ روز ایک نیا مرض ایجاد ہوتا ہے۔"

"آپ نے گاندھی گارڈن میں اس بوہری سیٹھ کو کار میں چہل قدمی کرتے نہیں دیکھا جو کہتا ہے کہ میں سار عمر دمے پر اتنی لاگت لگا چکا ہوں کہ اب اگر کسی اور مرض میں مرنا پڑا تو خدا کی قسم' خودکشی کر لوں گا۔" مرزا چٹکلوں پر اتر آئے۔

"واللہ! موت ہو تو ایسی ہو۔ (سسکی) مرحوم کے ہونٹوں پر عالم سکرات میں بھی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔"

"اپنے قرض خواہوں کا خیال آ رہا ہو گا۔" مرزا میرے کان میں پھسپھسائے۔

"گنہگاروں کا منہ مرتے وقت سور جیسا ہو جاتا ہے' مگر چشم بد دور۔ مرحوم کا چہرہ گلاب کی طرح کھلا ہوا تھا۔"

"صاحب! سلیٹی رنگ کا گلاب ہم نے آج تک نہیں دیکھا۔" مرزا کی ٹھنڈی ٹھنڈی ناک میرے کان کو چھونے لگی اور ان کے منہ سے کچھ ایسی آوازیں نکلنے لگیں جیسے کوئی بچہ چمکیلے فرنیچر پر گیلی انگلی رگڑ رہا ہو۔

اصل الفاظ تو ذہن سے محو ہو گئے' لیکن اتنا اب بھی یاد ہے کہ انگوچھے والے بزرگ نے ایک فلسفیانہ تقریر کر ڈالی جس کا مفہوم کچھ ایسا ہی تھا کہ جینے کا کیا ہے۔ جینے کو تو جانور بھی جی لیتے ہیں' لیکن جس نے مرنا نہیں سیکھا' وہ جینا کیا جانے۔ ایک متبسم خود سپردگی' ایک بے تاب آمادگی کے ساتھ مرنے کے لیے ایک عمر کا ریاض درکار ہے۔ یہ بڑے ظرف' بڑے حوصلے کا کام ہے' بندہ نواز!

پھر انھوں نے بے موت مرنے کے خاندانی نسخے اور ہنستے کھیلتے اپنی روح قبض کرانے کے

پینترے کچھ ایسے استادانہ تیور سے بیان کئے کہ ہمیں عطائی مرنے والوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نفرت ہو گئی۔

خاتمہ کلام اس پر ہوا کہ مرحوم نے کسی روحانی ذریعے سے سن گن پا لی تھی کہ میں سنیچر کو مر جاؤں گا۔

"ہر مرنے والے کے متعلق یہی کہا جاتا ہے۔" باتصویر قمیض والا ٹیڈی بوائے بولا۔

"کہ وہ سنیچر کو مر جائے گا؟" مرزا نے اس بد لگام کا منہ بند کیا۔

انگوچھے والے بزرگ نے شے مذکورہ سے، پہلے اپنے نری کے جوتے کی گرد جھاڑی پھر پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے مرحوم کے عرفان مرگ کی شہادت دی کہ جنت مکانی نے وصال سے ٹھیک چالیس دن پہلے مجھے فرمایا تھا کہ انسان فانی ہے۔

انسان کے متعلق یہ تازہ خبر سن کر مرزا مجھے تخلئے میں لے گئے۔ دراصل تخلئے کیا لفظ انہوں نے استعمال کیا تھا ورنہ جس جگہ وہ مجھے دھکیلتے ہوئے لے گئے، وہ زنانے اور مردانے کی سرحد پر ایک چبوترہ تھا، جہاں ایک میراثن گھونگھٹ نکالے ڈھولک پر گالیاں گا رہی تھی۔ وہاں انہوں نے اس شغف کی جانب اشارہ کرتے ہوئے جو مرحوم کو اپنی موت سے تھا، مجھے آگاہ کیا کہ یہ ڈراتا تو جنت مکانی اکثر کھیلا کرتے تھے۔ آدھی آدھی رات کو اپنی ہونے والی بیواؤں کو جگا کر دھمکیاں دیتے کہ میں اچانک اپنا سایہ تمہارے سر سے اٹھاؤں گا۔ چشم زدن میں مانگ اجاڑ دوں گا۔ اپنے بے تکلف دوستوں سے بھی کہا کرتے کہ واللہ! اگر خودکشی جرم نہ ہوتی تو کبھی کا اپنے گلے میں پھندا ڈال لیتا۔ کبھی یوں بھی ہوتا کہ اپنے آپ کو مردہ تصور کرکے ڈکرانے لگتے اور چشم تصور سے منجھلی کے سونٹا سے ہاتھ دیکھ کر کہتے، بخدا میں تمہارا رنڈاپا نہیں دیکھ سکتا۔

مرنے والے کی ایک ایک خوابی بیان کرکے خشک سسکیاں بھرتے اور سسکیوں کے درمیان سگریٹ کے کش لگاتے اور جب اس عمل سے اپنے اوپر رقت طاری کر لیتے تو رومال سے بار بار آنکھ کی بجائے اپنی ڈبڈبائی ہوئی ناک پونچھتے جاتے۔ پھر جب شدت گریہ

سے ناک سرخ ہو جاتی تو ذرا صبر آتا اور وہ عالم تصور میں اپنے کپکپاتے ہوئے ہاتھ سے تینوں بیواؤں کی مانگ میں یکے بعد دیگرے ڈھیروں افشاں بھرتے۔ اس سے فارغ ہو کر ہر ایک کو کہنیوں تک مہین مہین، پھنسی چوڑیاں پہناتے (بیاہتا کر چار چوڑیاں کم پہناتے تھے)

حالانکہ اس سے پہلے بھی مرزا کو کئی مرتبہ ٹوک چکا تھا کہ خاقانی ہند استاد ذوق ہر قصیدے کے بعد منہ بھر بھر کے کلیاں کیا کرتے تھے۔ تم پر ہر کلمے، ہر فقرے کے بعد واجب ہیں۔ لیکن اس وقت مرحوم کے بارے میں یہ اول جلول باتیں اور ایسے واشگاف لہجے میں سن کر میری طبیعت کچھ زیادہ ہی منغض ہو گئی۔ میں نے دوسروں پر ڈھال کر مرزا کو سنائی۔

"یہ کیسے مسلمان ہیں مرزا! دعائے مغفرت نہیں کرتے، نہ کریں۔ مگر ایسی باتیں کیوں بناتے ہیں یہ لوگ؟"

"خلق خدا کی زبان کس نے پکڑی ہے۔ لوگوں کا منہ تو چہلم کے نوالے ہی سے بند ہوتا ہے۔"

مجھے چہلم میں بھی شرکت کا اتفاق ہوا۔ لیکن سوائے ایک نیک طینت مولوی صاحب کے جو پلاؤ کے چاولوں کی لمبائی اور گلاوٹ کو مرحوم کے ٹھیٹ جنتی ہونے کی نشانی قرار دے رہے تھے، بقیہ حضرات کی گل افشانی گفتار کا وہی انداز تھا۔ وہی جگ جگ تھے، وہی چہچہے!

ایک بزرگوار جو نان قورمے کے ہر آتشیں لقمے کے بعد آدھا آدھا گلاس پانی پی کر قبل از وقت سیر بلکہ سیراب ہو گئے تھے، منہ لال کرکے بولے کے مرحوم کی اولاد نہایت ناخلف نکلی۔ مرحوم و مغفور شد و مد سے وصیت فرما گئے تھے کہ میری مٹی بغداد لے

جائی جائے۔ لیکن نافرمان اولاد نے ان کی آخری خواش کا ذرا پاس نہ کیا۔
اس پر ایک منہ پھٹ پڑوسی بول اٹھے۔ "صاحب! یہ مرحوم کی سراسر زیادتی تھی کہ انہوں نے خود تو تادم مرگ میونسپل حدود سے قدم باہر نہیں نکالا۔ حد یہ کہ پاسپورٹ تک نہیں بنوایا اور....."

ایک وکیل صاحب نے قانونی موشگافی کی "بین الاقوامی قانون کے بموجب پاسپورٹ کی شرط صرف زندوں کے لیے ہے' مردے پاسپورٹ کے بغیر بھی جہاں چاہیں جا سکتے ہیں۔"
"لے جائے جا سکتے ہیں۔" مرزا پھر لقمہ دے گئے۔
"میں کہہ یہ رہا تھا کہ یوں تو ہر مرنے والے کے سینے میں یہ خواہش سلگتی رہتی ہے کہ میرا کانسی کا مجسمہ (جسے قد آدم بنانے کے لیے بسا اوقات اپنی طرف سے پورے ایک فٹ کا اضافہ کرنا پڑتا ہے) میونسپل پارک کے بیچوں بیچ استادہ کیا جائے اور....."
"اور جملہ نازنیناں شہر چار مہینے دس دن تک میرے لاشے کو گود میں لیے' بال بکھرائے بیٹھی رہیں۔" مرزا نے دوسرا مصرع لگایا۔
"مگر صاحب! وصیتوں کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ ہمارے چھٹپن کا قصہ ہے۔ پیپل والی حویلی کے پاس ایک جھونپڑی میں ۱۹۳۹ء تک ایک افیمی رہتا تھا۔ ہمارے محتاط اندازے کے مطابق عمر ۶۶ سال سے کسی طرح کم نہ ہو گی' اس لیے کہ خود کہتا تھا کہ پینسٹھ سال سے تو افیم کھا رہا ہوں۔ چوبیس گھنٹوں انٹاغفیل رہتا تھا۔ ذرا نشہ ٹوٹتا تو مغموم ہو جاتا۔ غم یہ تھا کہ دنیا سے بے اولاد جا رہا ہوں۔ اللہ نے کوئے اولاد نرینہ نہ دی جو اس کی بان کی چارپائی کی جائز وارث بن سکے اس کے متعلق محلے میں مشہور تھا کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد سے نہیں نہایا ہے۔ اس کو اتنا تو ہم نے بھی کہتے سنا کہ خدا نے پانی صرف پینے کے لیے بنایا تھا مگر انسان بڑا ظالم ہے۔

راحتیں اور بھی ہیں غسل کی راحت کے سوا

ہاں تو صاحب! جب اس کا دم آخر ہونے لگا تو محلے کے

مسجد کے امام کا ہاتھ اپنے ڈوبتے دل پر رکھ کر یہ قول و قرار کیا کہ میری میت کا غسل نہ دیا جائے۔ بس پولے پولے ہاتھوں سے تیمم کرا کے کفنا دیا جائے ورنہ حشر میں دامن گیر ہوں گا۔"

وکیل صاحب نے تائید کرتے ہوئے فرمایا۔ "اکثر مرنے والے اپنے کرنے کے کام پسماندگان کو سونپ کر ٹھنڈے ٹھنڈے سدھار جاتے ہیں۔ پچھلی گرمیوں میں دیوانی عدالتیں بند ہونے سے چند یوم قبل ایک مقامی شاعر کا انتقال ہوا۔ واقعہ ہے کہ ان کے جیتے جی کسی فلمی رسالے نے بھی ان کی عریاں نظموں کو شرمندہ طباعت نہ کیا۔ لیکن آپ کو حیرت ہو گی کہ مرحوم اپنے بھتیجے کو ایصال ثواب کی یہ راہ سجھا گئے کہ بعد مردن میرا کلام حنائی کاغذ پر چھپوا کر سال کے سال میری برسی پر فقیروں اور مدیروں کو بلا ہدیہ تقسیم کیا جائے۔

پڑوسی کی ہمت اور بڑھی "اب مرحوم ہی کو دیکھئے' زندگی میں ہی ایک قطعہ اراضی اپنی قبر کے لیے بڑے ارمانوں سے رجسٹری کرا لیا تھا گو کہ بچارے اس کا قبضہ پورے بارہ سال بعد لے پائے۔ نصیحتوں اور وصیتوں کا یہ عالم تھا کہ موت سے دس سال پیشتر اپنے نواسوں کے ایک فہرست حوالے کر دی تھی' جس میں نام بنام لکھا تھا کہ فلاں ولد فلاں کو میرا منہ نہ دکھایا جائے۔ (جن حضرات سے زیادہ آزردہ خاطر تھے' ان کے نام کے آگے ولدیت نہیں لکھی تھی) تیسری شادی کے بعد انہیں اس کا طویل ضمیمہ مرتب کرنا پڑا' جس میں تمام جوان پڑوسیوں کے نام شامل تھے۔"

"ہم نے تو یہاں تک سنا ہے کہ مرحوم نہ صرف اپنے جنازے میں شرکاء کی تعداد متعین کر گئے بلکہ آج کا چہلم کا "مینو" بھی خود ہی طے فرما گئے تھے۔" وکیل نے خاکے میں شوخ رنگ بھرا۔

اس نازک مرحلے پر خشخشی داڑھی والے بزرگ نے پلاؤ سے سیر ہو کر اپنے شکم پر ہاتھ پھیرا اور مینو کی تائید و توصیف میں ایک مسلسل ڈکار داغی' جس کے اختتام پر اس معصوم حسرت کا اظہار فرمایا کہ کاش آج مرحوم زندہ ہوتے تو یہ انتظامات دیکھ کر کتنے خوش

ہوتے۔
اب پڑوسی نے تیغ زبان کو بے نیام کیا "مرحوم سدا سے سوء ہضم کے مریض تھے۔
غذا تو غذا' بچارے کے پیٹ میں بات تک نہیں ٹھہرتی تھی۔ چٹ پٹی چیزوں کو ترستے
ہی مرے۔ میرے گھر میں سے بتا رہی تھیں کہ ایک دفعہ ملیریا میں سرسام ہو گیا
اور لگے بہکنے۔ بار بار اپنا سر منجھلی کے زانو پر پٹختے اور سہاگ کی قسم دلا کر یہ وصیت
کرتے تھے کہ ہر جمعرات کو میری فاتحہ' چاٹ اور کنواری بکری کی سری پر دلوائی جائے۔"
مرزا پھڑک ہی تو گئے۔ ہونٹ پر زبان پھیرتے ہوئے بولے "صاحب! وصیتوں کی کوئی
حد نہیں' ہمارے محلے میں ڈیڑھ پونے دو سال پہلے ایک سکول ماسٹر کا انتقال ہوا' جنہیں
میں نے عید بقر پر بھی سالم و ثابت پاجامہ پہنے نہیں دیکھا۔ مگر مرنے سے پہلے وہ بھی
اپنے لڑکے کو ہدایت کر گئے کہ "پل بنا چاہ بنا مسجد و تالاب بنا"
لیکن حضور ابا کی آخری وصیت کے مطابق فیض کے اسباب بنانے میں لڑکے کی مفلسی
علاوہ ملک کا قانون بھی مزاحم ہوا۔"
"یعنی کیا؟" وکیل صاحب کے کان کھڑے ہوئے۔
"یعنی یہ کہ آج کل پل بنانے کی اجازت صرف پی ڈبلیو ڈی کو ہے۔ اور بالفرض محال
کراچی میں چار فٹ گہرا کنواں کھود بھی لیا تو پولیس اس کا کھاری کیچڑ پینے والوں
کا چالان اقدام خودکشی میں کر دے گی۔ یوں بھی پھیٹپچر سے پھیٹپچر قصبے میں آج کل
کنویں صرف ایسے ویسے موقعوں پر ڈوب مرنے کے لیے کام آتے ہیں۔ رہے تالاب'
تو حضور! لے دے کے ان کا یہ مصرف رہ گیا ہے کہ دن بھر ان میں گاؤں کی
بھینسیں نہائیں اور صبح جیسی آئی تھیں' اس سے کہیں زیادہ گندی ہو کر چراغ جلے باڑے
میں پہنچیں۔"
خدا خدا کرکے یہ مکالمہ ختم ہوا تو پٹاخوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔
"مرحوم نے کچھ چھوڑا بھی؟"

"بچے چھوڑے ہیں۔"
"مگر دوسرا مکان بھی تو ہے۔"
"اس کے کرائے کو اپنے مزار کی سالانہ مرمت سفیدی کے لیے وقف کر گئے ہیں۔"
"پڑوسیوں کا کہنا ہے کہ بیاہتا بیوی کے لیے ایک انگوٹھی بھی چھوڑی ہے۔ اگر اس کا نگینہ اصلی ہوتا تو کسی طرح بیس ہزار سے کم کی نہیں تھی۔"
"تو کیا نگینہ جھوٹا ہے؟"
"جی نہیں، اصلی امی ٹیشن ہے۔"
"اور وہ پچاس ہزار کی انشورنس پالیسی کیا ہوئی؟"
"وہ پہلے ہی منجھلی کے مہر میں لکھ چکے تھے۔"
"اس کے بارے میں یار لوگوں نے لطیفہ گھڑ رکھا ہے کہ منجھلی بیوہ کہتی ہے کہ سرتاج کے بغیر زندگی اجیرن ہے۔ اگر کوئی ان کو دوبارہ زندہ کر دے تو میں بخوشی دس ہزار لوٹانے کو تیار ہوں۔"
"ہم نے خانگی ذرائع سے سنا ہے کہ اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، مرحوم منجھلی پر ایسے لہلوٹ تھے کہ اب بھی رات برات، خوابوں میں آ آ کر ڈراتے ہیں۔"
"مرحوم اگر ایسا کرتے ہیں تو بالکل ٹھیک کرتے ہیں۔ ابھی تو ان کا کفن بھی میلا نہیں ہوا ہو گا۔ مگر سننے میں آیا ہے کہ منجھلی نے رنگ چنے دوپٹے اوڑھنا شروع کر دیئے ہیں۔"
"اگر منجھلی ایسا کرتی ہے تو بالکل ٹھیک کرتی ہے۔ آپ نے سنا ہو گا کہ ایک زمانے میں لکھنؤ کے نچلے طبقے میں یہ رواج تھا کہ چالیسویں پر نہ صرف انواع و اقسام کے پر تکلف کھانوں کا اہتمام کیا جاتا، بلکہ بیوہ بھی سولہ سنگھار کرکے بیٹھتی تھی تا کہ مرحوم کی ترسی ہوئی روح کماحقہ، متمتع ہو سکے۔" مرزا نے ح اور ع صحیح مخرج سے ادا کرتے ہوئے مرے پر آخری درہ لگایا۔

واپسی پر راستے میں میں نے مرزا کو آڑے ہاتھوں لیا' جمعہ کو تم نے وعظ نہیں سنا؟ مولوی صاحب نے کہا تھا کہ مرے ہوؤں کا ذکر کرو تو اچھائی کے ساتھ موت کو نہ بھولو کہ ایک نہ ایک دن سب کو آنی ہے۔"

سڑک پار کرتے کرتے ایک دم بیچ میں اکڑ کر کھڑے ہو گئے۔ فرمایا "اگر کوئی مولوی یہ ذمہ لے لے کہ مرنے کے بعد میرے نام کے ساتھ رحمتہ اللہ لکھا جائے گا تو آج ہی' اسی وقت' اسی جگہ مرنے کے لیے تیار ہوں۔ تمہاری جان کی قسم!"

آخری فقرہ مرزا نے ایک بے صبری کار کے بمپر پر تقریباً اکڑوں بیٹھ کر جاتے ہوئے ادا کیا۔

****

دُعاگو
شاھدریاض
shahid.riaz@gmail.com